(1)

جب گلاب کی پنکھڑیوں میں چھپے ہوئے میٹھے شہد کی خوشبو جنگل میں اڑتی ہے اور آم کے درختوں پر آیا ہوا بور اپنا شیریں رس زمین پر ٹپکانے لگتا ہے۔ تو بھنوروں کی ٹولیاں بے قرار ہو کر ان کی تلاش میں چل نکلتی ہیں۔ اسی طرح ایک رات جنوبی سمندروں کی مرطوب ہوا ہمارے شہر میں سے گزری تو میں چھت پر لیٹے لیٹے۔ بے تاب ہو کر اٹھ بیٹھا۔ اس ہوا میں سمندر کے کنارے اُگے ہوئے ناریل کے درختوں کی خوشبو تھی یہ ہوا مدراس کی طرف سے آرہی تھی۔ ساحل کارومنڈل سے بھی دور کولمبو سے آرہی تھی۔ جزیرہ لنکا کے گھنے جنگلوں کی طرف سے آرہی تھی۔ میں نے سرہانے کے نیچے سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور اپنی چارپائی پر آلتی پالتی مار کر گوتم بدھ کی طرح بیٹھ گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور چپکے چپکے سگریٹ پیتا رہا۔ کوئی پانچ منٹ کے بعد مجھے گیان مل گیا۔ میں نے سگریٹ دوسرے مکان کی چھت پر پھینک دیا اور اندھیری رات کے آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں کو دیکھ کر کہا۔

"کولمبو چلو۔"

جن دنوں میں پانچویں یا چھٹی جماعت میں پڑھا کرتا تھا میں نے اردو کی کتاب میں لنکا کی ایک تصویر دیکھی تھی۔ اس تصویر میں کیلے کے چوڑے چوڑے پتوں کے بیچ میں ایک جھونپڑی تھی جس کے باہر دو عورتیں زرد کیلوں کے گچھے اٹھائے کھڑی تھیں۔ ان عورتوں کا رنگ براؤن تھا۔ اور بدن کے گرد صرف ایک دھوتی لپیٹ رکھی تھی۔ ان کے چہرے بڑے اداس تھے۔ اس تصویر نے میرے دل و دماغ پر گہرا اثر کیا تھا اور میں نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ بڑے ہو کر اس ملک کی سیر کو ضرور نکلوں گا۔ جہاں کیلے کے درختوں کے جھنڈ ہوتے ہیں اور براؤن رنگ کی نیم عریاں اداس عورتیں کیلوں کے زرد گچھے لیے

جھونپڑیوں کے باہر کھڑی ہوتی ہیں۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا کیلے کے درختوں کے پاس کھڑی سانولی عورتوں کے اداس چہرے دھندلے ہونے لگے۔ ایم۔ اے۔ او کالج امرتسر کے گیٹ پر کھڑے ہو کر میں اپنے دوستوں کے ساتھ بھوسا دل کے ہری چھیل کے کیلے کھاتا مگر مجھے لنکا دیس کی اداس عورتوں کا کبھی خیال نہ آتا۔

اس رات جب جنوبی ہند کے سمندر کی طرف سے مرطوب ہوا کے جھونکوں نے میرے شہر کی فضاؤں میں ناریل کے درختوں کی خوشبو اڑائی تو میں چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ اسی وقت مجھے گیان ہوا کہ لنکا دیس کی سیر کرنی چاہیئے۔ مجھے وہ ساری سانولی اور اُداس عورتیں کیلے کے گنجان درخت اور ان درختوں کے بیچ میں بنی ہوئی بانس کی جھونپڑیاں یاد آ گئیں۔

ان دنوں میں کالج چھوڑ کر بیکار بیٹھا تھا اور والد صاحب مجھے پہلوانی کا فن سکھلا رہے تھے۔ وہ مجھے امرتسر کا نامی گرامی پہلوان بنانا چاہتے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ میں ایک بار کیکر سنگھ کے بیٹے سے کشتی لڑ کر اسے گرادوں۔ لائن پار شیخ چلی کے اکھاڑے میں وہ مجھے کثرت کرایا کرتے۔ منہ اندھیرے مجھے ساتھ لے کر وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ میں جانگیہ پہن کر اکھاڑے میں ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ جاتا۔ وہ میرے سارے بدن پر تیل کی مالش کرتے۔ پھر وہ مجھے اکھاڑے میں کھینچ لیتے اور بڑی بیدردی سے دھول دھپہ شروع کر دیتے۔ میری گردن میں ہاتھ ڈال کر زور زور سے جھٹکے دیتے۔ کبھی ٹانگ میں ٹانگ اڑا کر مجھے دھم سے گرا دیتے۔ کبھی کلاجنگ مار کر چاروں شانے چت گرا دیتے اور کبھی میری کمر پر سوار ہو کر ایک ٹانگ کو مروڑنا شروع کر دیتے۔ ساتھ ساتھ کہتے جاتے۔

"اسے بھی یاد رکھنا پترا۔ ہت تیرے شیر کی----"

میری جان مصیبت میں آئی ہوتی۔ ڈنٹر پیل پیل کر پہلے ہی برا حال ہو گیا ہوتا۔ اب جو اوپر سے دھول دھپا ہوتا تو سارا بدن درد کرنے لگتا۔ اکھاڑے کی گیلی گیلی مٹی میں اوندھے منہ پڑا ہونکتا رہتا لیکن والد صاحب مجھے کیکر پہلوان کے بیٹے سے لڑوانا چاہتے تھے۔ وہ کمر میں دونوں ہاتھ ڈال کر مجھے زمین پر سے اٹھاتے اور دوسری طرف گرا دیتے میں دل ہی دل میں اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے پروگرام بنایا کرتا مگر والد صاحب بڑے جبر جنگ قسم کے آدمی تھے۔ ان کے چنگل سے بچ نکلنا محال تھا۔ جس رات میں نے کولمبو جانے کا منصوبہ بنایا اس کے دوسرے روز اکھاڑے میں میں نے والد صاحب کے بدن پر

اکھاڑے کی مٹی ڈالتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"میں کولمبو جاؤں گا۔ ابا جی۔"

والد صاحب نے سنی ان سنی کرتے ہوئے دو تین ایسی دھولیں ماریں کہ میرے ساتھ کولمبو بھی چکرا گیا۔ میں نے سوچا والد صاحب نے میری بات سنی نہیں۔ میں نے پھر کہا۔

"میں کولمبو جانا چاہتا ہوں"۔

والد صاحب نے اب کے ایسا دھوبی پٹڑا مارا کہ میں قلابازی کھا کر پرے جا گرا۔ جب میں نے تیسری بار ان کے گوش گزار کیا تو انہوں نے اپنے کان میں سے مٹی جھاڑتے ہوئے کہا۔

"وہ کیا شے ہے؟"

میں نے کہا۔

"کولمبو بڑا خوبصورت شہر ہے ابا جی۔ وہ لنکا کا دارالحکومت ہے۔ وہاں کیلے کے درختوں کے بڑے بڑے جنگل ہیں اور ناریل کے جھنڈ----"

"تیرے ناریل کی ماں کی ایسی کی تیسی ---- کیکر سنگھ کے بیٹے سے دنگل کون کرے گا؟ ایں!"

اس کے ساتھ ہی انہوں نے وہ دھول لگائی کہ کولمبو کا سارا جزیرہ ہل گیا۔

میں نے بڑے بھائی صاحب سے کہا۔

"بھائی جان میں کولمبو جانا چاہتا ہوں۔"

بکواس بند کرو۔"

"بھائی جان میں وہاں ضرور جاؤں گا۔"

"وہاں کیا کرے گا۔؟"

"سیر کروں گا۔"

"ایک بار پھر بکواس بند کرو۔"

لیکن میں فیصلہ کر چکا تھا کہ لنکا ضرور جاؤں گا۔ جس طرح گلاب کی خوشبو کے اڑتے ہی بھنورا اپنے آپ کو اس کی طرف جانے سے نہیں روک سکتا۔ اسی طرح میں بھی جنوبی

Murtaza A. Siddiqui
mascom4u@gmail.com
NOVELS URDU

سمندروں کی مرطوب ہواؤں کے سندیسے کے بعد امرتسر میں نہیں رہ سکتا تھا۔ میں نے رختِ سفر باندھ لیا تھا۔ اپنی کشتی کا لنگر اٹھا لیا تھا اور بادبان کھول دیئے تھے۔ اب صرف موافق سمت کو چلنے والی ہوا کا انتظار کر رہا تھا۔ کہیں سے سمندر کی طرف چلنے والی ہوا کا جھونکا آجائے۔ کہیں سے کچھ روپوں کا بندوبست ہو جائے۔ کسی طرح کولمبو پہنچ جاؤں۔ وہاں جا کر مجھے پروا نہیں تھی۔ میں نوکری کر لوں گا۔ ایف اے پاس ہوں اور پھر ٹائپ بھی جانتا ہوں۔ کہیں نہ کہیں کام مل ہی جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ اب روپے کہاں سے آئیں؟ میرے پاس صرف پچاس روپے جمع تھے۔ میرے ایک دوست نے مجھے ایک سو روپے کر کے دے دیئے۔ پچاس روپے میں نے اپنی بڑی ہمشیرہ سے لیے۔ مجھے خیال آیا پچاس روپے اپنے بڑے بھائی سے لئے جا سکتے ہیں۔

"بکواس بند کرو۔"

میں نے یہ خیال ترک کر دیا۔ میرے پاس دو سو روپیہ موجود تھا۔ سو روپیہ والدہ سے ادھر اُدھر کی باتیں کر کے ہتھیا لیا۔ ایک صد روپیہ والد صاحب کی صدری کی جیب سے اڑایا اور گھر سے بھاگ کر کسی کو اطلاع دیئے بغیر اپنا سوٹ کیس اٹھا کر امرت سر کے سٹیشن پر آ گیا۔ فرنٹیر میل ان دنوں امرت سر سے رات کو چلا کرتی تھی۔ میں نے مدراس کا تیسرے درجے کا ٹکٹ کٹوایا اور گاڑی میں سوار ہو گیا۔ میں چھپ کر بیٹھا رہا۔ اس خیال سے کہ کہیں والد صاحب کے پہلوان شاگردوں کا ٹولہ مجھے گرفتار نہ کر لے۔ گاڑی جب شریف پورے سے آگے نکل گئی تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور سوٹ کیس سیٹ کے نیچے دھکیل کر کھڑکی کے پاس ہو کر بیٹھ گیا۔ ڈبہ مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔ برسات کا موسم تھا۔ سٹیشن پر گاڑی رکتی تو اندر حبس کے مارے دم گھٹنے لگتا۔ جب چلتی تو ہوا لگتی۔ ایک موٹا لالہ اپنا سر میرے کندھے پر رکھے سو رہا تھا۔ میں نے اپنا سر کھڑکی کے ساتھ لگا رکھا تھا۔ جالندھر نکلا تو مجھے نیند آنے لگی۔ کھڑکی کے ساتھ لگے لگے سو گیا جس طرح وہ ہندو لالہ میرے کندھے سے لگے لگے سو رہا تھا۔ اور ہلاکت خیز خراٹے لے رہا تھا۔

گاڑی میرٹھ کے سٹیشن پر پہنچی تو دن نکل آیا تھا۔ لالہ نے رام رام کرتے اپنا سر میرے کندھے پر سے اٹھایا اور منہ پر ہاتھ پھیر کر بولا۔

کیوں جی کون سا شہر ہے یہ؟"

"میرٹھ۔"

"ابھی دلی دور ہے۔"

اتنا کہہ کر اس نے پھر اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیا۔ میں نے بڑے اطمینان سے اس کا ناریل ایسا منڈا ہوا سر پکڑ کر دوسرے آدمی کے کندھے پر رکھ دیا۔ اس آدمی نے چونک کر اپنے کندھے پر دوسرا سر دیکھا تو بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور اپنا سر جھٹک کر لالے کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ دلی پہنچ کر مجھے گاڑی بدلنی تھی اور مدراس جانے والی ٹرین میں سوار ہونا تھا۔ دلی سٹیشن پر بڑی چہل پہل تھی۔ بمبئی جانے والی سواریوں کا ہجوم لوٹے، پاندان اور اگالدان اٹھائے فرنٹیر میل کی طرف بڑھا۔ میں نے سوٹ کیس قلی کے سر پر رکھا اور خود بمبئی کی سواریوں کی ٹانگوں میں سے ہو کر باہر پلیٹ فارم پر نکل آیا۔ ایک عورت نے اپنا گرارا کھینچ کر چیخ ماری۔

"اوئی یہ کون ہے موا؟"

میں نے نیچے ہی نیچے سے جواب دیا۔

"میں ہوں بُوا۔"

پلیٹ فارم پر آ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا اور قلی سے پوچھا کہ مدراس جانے والی گاڑی کون سے پلیٹ فارم پر کھڑی ہے۔ اس قلی نے بڑی کرخنداری زبان میں بتایا کہ گاڑی نمبر 5 پر کھڑی ہے اور ایک گھنٹہ بعد چھوٹے گی۔ وہاں جا کر دیکھا کہ گاڑی میں تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ ہر ڈبہ منہ در منہ بھرا ہوا ہے۔ بڑی مشکل سے سیکنڈ کلاس کے ساتھ لگے ایک نوکروں کے ڈبے میں میں نے سوٹ کیس رکھوایا قلی کو پیسے دیئے اور خود ایک جگہ جا کر چائے وغیرہ پی۔ منہ ہاتھ دھویا۔ ڈبے والوں سے میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ کسی کا نوکر نہیں ہوں۔ انہوں نے کمال مہربانی سے مجھے غسل خانے کے دروازے کے ساتھ کھڑے ہونے کو جگہ دے دی۔ ایک آدمی نے پوچھا۔

"کہاں جاؤ گے میاں؟"

"مدراس۔"

وہ آدمی ذرا چونکا۔

"ارے میاں اتنی دور کیا کھڑے ہی کھڑے جاؤ گے۔؟"

Murtaza A. Siddiqui murtazascom4u@gmail.com NOVELS URDU STORIES

میں نے کہا۔

"بزرگوں سے سن رکھا ہے جب گاڑی چلتی ہے تو جگہ اپنے آپ بن جایا کرتی ہے۔"

وہ آدمی ہنس دیا۔

"ارے میاں گھبراؤ نہیں ہم تمہیں تھوڑی بہت جگہ بنا دیں گے۔ لیکن میاں تم ذرا "ڈیل ڈول" کے اچھے ہو۔ کسی کو اوپر نہیں چڑھنے دینا اب یہ تمہاری ڈیوٹی لگا دی ہے ہم نے سمجھے میاں۔"

"سمجھ گیا میاں جی۔"

اس کے بعد میں تن کر دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ چار آدمیوں نے پاگلوں کی طرح اندر گھسنے کی کوشش کی جن میں سے ایک کو میں نے گردن پر گھونسا مارا۔ دوسرے کے ہاتھ پر مکا مارا۔ تیسرے نے میری ناک پر مکا مارا۔ اور چوتھا ڈر کے مارے دوسرے ڈبے کی طرف بھاگ گیا۔

اس لڑائی نے ڈبے والے نوکروں اور صاحب لوگوں کے بیروں پر میری دھاک بٹھا دی اور انہوں نے بڑی خوشی سے مجھے کھڑکی کے پاس ایک صندوق پر بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ کیونکہ مدراس کے راستے میں ان گنت سٹیشن پڑتے تھے اور ہر سٹیشن پر مسافروں کے ہجوم نے اس ڈبے پر دھاوا بولنا تھا۔

خدا خدا کر کے گاڑی روانہ ہوئی۔ تھی تو یہ گاڑی مدراس ایکسپریس۔ مگر اس شریف زادی نے شاید ہی کوئی سٹیشن راستے میں چھوڑا ہو۔ اگر غلطی سے کوئی سٹیشن راستے میں نکل جاتا تو واپس پلٹ کر وہاں آن کھڑی ہوتی اور پھر بڑی تیزی سے دوسرے سٹیشن پر کھڑی ہونے کے لئے وہاں سے بھاگنا شروع کر دیتی۔ دو دن اور دو رات کے سفر نے میری کمر توڑ دی۔ میرے ڈبے والے نوکر اور بیروں کو قریباً ہر سٹیشن پر بھاگ کر اپنے اپنے صاحب لوگوں کی خدمات کو دوڑنا پڑتا۔ ان کے بھی حلیے بگڑ گئے۔ مدراس پہنچ کر انہیں دیکھا تو جو مسافر کہ سٹیشن پر جوان تھا وہ بوڑھا نظر آتا تھا۔ جو بوڑھا تھا وہ قریب المرگ معلوم ہو رہا تھا۔ دلی سے چلے تو ناگ پور نے آنے کا نام نہ لیا۔ ہر کوئی یہی کہتا کہ بس اب ناگ پور آ رہا تھا۔ ناگ پور کے سنگترے بڑے مشہور تھے۔ اچھا اسٹیشن آئے پوری درجن سنگتروں کی کھائیں گے لیکن ناگپور مدراس ایکسپریس کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر پیچھے کی طرف بھاگ رہا تھا۔ اپنے

سارے سنگترے کے باغوں کو لے کر وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا چلا جا رہا تھا۔ آخر کسی نہ کسی طرح ناگپور آ ہی گیا۔ بہت بڑا سٹیشن تھا۔ گاڑی ایک پُل پر سے گزری۔ نیچے چوک میں سبھاش چندر بوس کا ایک مجسمہ نصب تھا۔ لوگ سائیکلوں، بیل گاڑیوں اور موٹر گاڑیوں میں آ جا رہے تھے۔ پلیٹ فارم پر سنگترے بک رہے تھے۔ ان کی رنگت سبز تھی لیکن بڑے میٹھے تھے۔ یہاں کھانا کھایا، سنگترے کھائے، پانی پیا اور اس امید میں ریل میں سوار ہو گئے کہ بیوارڈہ بھی آئے گا۔

بیوارڈہ اس سے آگے بہت بڑا جنکشن تھا مگر اُس نے بھی ناگ پور والا ہاتھ دکھایا۔ پوری رات گزر گئی لیکن بیوارڈہ صاحب نہ آئے۔ اگلے روز دوپہر کے بعد جب کمر ہمت ٹوٹ گئی تو بیوارڈہ کا اسٹیشن آیا۔ یہاں گاڑی کو ایک گھنٹہ کھڑے ہونا تھا۔ یہاں سے پہاڑی راستہ شروع ہوتا تھا۔ بیوارڈہ کا شہر پہاڑ کی ڈھلان پر پھیلا ہوا صاف نظر آ رہا تھا۔ میری شیو بڑھ آئی تھی۔ پلیٹ فارم پر گھوم پھر کر حجام کی تلاش کی مگر بے سود آخر ایک جگہ چپ چاپ ناچار ہو کر بیٹھ گیا۔ اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ پلیٹ فارم کے جنگلے کی دوسری طرف ایک دھوتی پوش بھنگ آدمی کھڑا ہے اور دور سے مجھے استرا دکھلا کر اپنے پاس بلا رہا ہے۔ میں ڈر گیا۔ اس کا انداز بالکل ایسا تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ ذرا آؤ میں بڑی محبت سے تمہارا گلا کاٹوں گا۔ لیکن جب یقین ہو گیا کہ وہ حجام ہے تو میں جنگلے کے پاس گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ واقعی حجام ہے اور اندر اس لئے نہیں آ رہا تھا کہ حجاموں کو پلیٹ فارم پر آنے کی اجازت نہیں۔ میں جنگلے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دوسری طرف کھڑے کھڑے میرے گالوں پر صابن ملنا شروع کر دیا۔ پھر استرا چلانے لگا۔ اُسترا وہ میرے گالوں پر چلا رہا تھا اور چوری آنکھ سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ کہیں کوئی ریلوے کا ملازم تو اُسے قانون کی خلاف ورزی کرتے نہیں دیکھ رہا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دو تین جگہوں پر سے جلد کٹ گئی اور خون بہنے لگا۔

"کیا کرتے ہو کمینے!"

"ٹھیک ہو گا بابو۔ ٹھیک کر دے گا۔ معافی دے گا۔"

اس کے ساتھ ہی اُس نے پھٹکڑی نکال کر گالوں پر پھیرنا شروع کر دی۔ پھٹکڑی زخم پر تیزاب کی طرح لگی۔ میری چیخیں نکل گئیں۔ لیکن حجام نے پوری طرح مجھے قابو میں کیا ہوا

NOVELS URDU STORIES Murtaza A. Siddiqui masoom4u@gmail.com

تھا۔ وہ ٹھڈی پر استرا چلا رہا تھا کہ اچانک مجھے وہیں چھوڑ کر لائنوں کی طرف بھاگ گیا۔ معلوم ہوا کہ ایک ریلوے افسر نے اُسے دیکھ لیا تھا اور وہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا یہ ریلوے افسر لاہور کے ریلوے سٹیشن کے قلی سے ملتا جلتا تھا مجھے دیکھ کر بولا۔

"ادھر داڑھی واڑھی نہیں ہوگا بابو ادھر زری مانہ ہوگا زری مانہ"

میں نے ٹھڈی پر بچے ہوئے سخت بالوں پر انگلیاں پھیر کر کہا۔

"تم کہاں سے آ گئے کھوتے دے پتر۔"

"کیا بولا بابو۔"

بولو تم "خانہ برانداز کے پتر ہو۔"

وہ ہنس پڑا۔ کالا کالا جبڑا کھل گیا اور دانت باہر نکل آئے۔ میرا ناکام بھگوڑا حجام دور لائنوں میں کھڑا استرا دکھا کر مجھے اپنی طرف بلا رہا تھا۔ ادھر گاڑی نے سیٹی دے دی۔ میں نے دونی اس کی طرف پھینک دی اور اپنی گاڑی کی طرف اٹھ دوڑا۔ ڈبے میں پہنچ کر جب میرے ساتھیوں نے میرے چہرے کی حالت دیکھی تو سب ہنسنے لگے۔ میں نے پوری کہانی سنائی تو وہ زیادہ ہنسے۔ ایک بیرے نے اپنے ٹرنک میں سے سیفٹی ریزر نکال کر دیا۔ جس کی مدد سے میں نے اپنی داڑھی کے باقی بالوں کو صاف کیا۔ بیہواڑہ سے نکل کر مدراس ایکسپریس کی رفتار غیر متوقع طور پر تیز ہو گئی اور اس نے شاید نشے میں آ کر دھڑا دھڑ چھوٹے چھوٹے سٹیشن چھوڑنا شروع کر دیئے۔ میرے ایک ساتھی نے کہا۔

"ڈرائیور نے شراب پی لی ہے وگرنہ یہ گاڑی ایسی حرکت کبھی نہیں کر سکتی۔"

اب مدراس کی آمد آمد تھی۔ اونچے اونچے ٹیلے کھیتوں جنگلوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ دریائے نربدا گذر گیا تھا۔ تاپتی گذر گیا تھا۔ گوداوری گذر گیا تھا اور اب دریائے کرشنا گذر رہا تھا۔ ایک پل زیر تعمیر تھا۔ یہاں پر سے گذرتے ہوئے گاڑی کی رفتار کم ہو گئی۔ نیچے مزدور عورتیں اور مرد کام کر رہے تھے۔ کوئی زمین کھود رہا تھا۔ کوئی گارا اٹھا رہا تھا۔ کوئی پتھر ڈھو رہا تھا۔ مرد صرف لنگوٹ پہنے ہوئے تھے۔ کالے اور پتلے دبلے کمزور بیمار۔۔۔ فاقہ زدہ ۔۔۔ عورتوں نے صرف ایک ہی چیتھڑا جسم پر لپیٹ رکھا تھا۔ وہ بھی بیمار اور کمزور تھیں۔ بدن ننگے ہو رہے تھے۔ مگر جانوروں کی طرح کام کر رہی تھیں۔ اگر کام نہ کریں تو کھائیں کہاں سے؟ مدقوق بچے ایک طرف سائے میں لیٹے رو رہے تھے۔ ان لوگوں نے گاڑی گزرتی دیکھی

تو کام چھوڑ دیا اور ہاتھ پھیلا کر مانگنے لگے۔ لوگوں نے ٹرین کی کھڑکیوں میں سے ڈبل روٹی کے ٹکڑے، بیڑیاں اور پیسے نیچے پھینکے جن پر یہ مزدور عورتیں اور مرد کتوں کی طرح جھپٹ پڑے۔ اس افراتفری میں کئی مزدور عورتوں کی چھاتیوں پر سے چیتھڑے پھسل گئے اور وہ ننگی ہو گئیں۔ جس پر گاڑی میں بیٹھے ہوئے شوقین مزاج مخیر حضرات نے خوب خوب آوازے کسے میرے پاس بیٹھے ہوئے راولپنڈی کے بیرے نے زور سے چٹخارا لیا اور ہاتھ باہر نکال کر بولا۔

"چلو سو ہنیوں سیل کرائی لیا ئیے۔"

دائیں بائیں پام، ناریل اور کیلے کے درختوں میں گھرے ہوئے بنگلوں، پختہ عمارتوں اور کارخانوں کی لمبی لمبی چمنیوں نے پہلے ہی بتا دیا کہ مدراس آ رہا ہے۔ یہاں آسمان پر کالی بدلیاں چھائی ہوئی تھیں اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ گاڑی ایک بہت بڑی ریل کی پٹڑیوں کے میدان میں سے گذر کر مدراس سٹیشن کے پلیٹ فارم میں داخل ہو گئی۔ سبز سبز پگڑیوں، سفید کوٹوں اور سفید دھوتیوں والے ٹکٹ چیکر پلیٹ فارم پر ادھر اُدھر کھڑے تھے۔ میرے ڈبے کے نوکروں اور بیروں نے منہ ہاتھ دھو کر چھوٹے چھوٹے آئینے سامنے رکھ کر خوب بال وغیرہ چمکا لیے تھے اور صاف ستھرے کپڑے پہن لیے تھے۔ گاڑی پلیٹ فارم پر رکی تو قلیوں کے ایک ہجوم نے اُس پر حملہ کر دیا۔ میں نے اپنا سوٹ کیس ایک قلی کے سر پر رکھا اور اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ ہمارے ٹکٹ راستے میں ہی ریلوے کے ملازموں نے چیک کر لیے تھے۔ چنانچہ یہاں ٹیکسیاں اور گھوڑے گاڑیاں اور بیل گاڑیاں پلیٹ فارم کے ساتھ ہی سڑک پر کھڑی تھیں۔ ہوٹل کے ایجنٹ آگے بڑھ بڑھ کر اپنے اپنے ہوٹلوں کے کارڈ دکھلا رہے تھے اور بڑی چرب زبانی سے مسافروں کو پھانسنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے ہر ایجنٹ کے ہاتھ سے کارڈ لے کر اُسے دیکھا، پڑھا اور پھر واپس کر دیا اور گھوڑا گاڑی میں سوٹ کیس رکھوا لیا۔

"مہاں کو بابو؟"

"سرائے میں۔"

گاڑی مدراس کے بازاروں میں سے گزرنے لگی اور نیچی اونچی پختہ عمارتیں، چوڑی چوڑی سڑکیں، سڑکوں پر بھاگتے ہوئے رکشا، موٹر گاڑیاں، سائیکل سوار اور بیل گاڑیاں اور

Muzaza Siddiqui
mascm4u@gmail.com
NOVELS UPDATES STORIES
Muzaza Siddiqui
mascm4u@gmail.com

ٹرامیں ----- سرخ اور سبز ساڑھیوں میں ملبوس مرہٹہ اور مدراسی عورتیں سیاہ رنگت، بالوں میں لگے ہوئے سفید پھول کانوں میں سبز پتھر، کلائیوں میں سرخ چوڑیاں اور پاؤں میں چمڑے کے معمولی چپل--- فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ اُگے ہوئے تاڑ کے درخت ریستورانوں سے آتی ہوئی اگر بتیوں کی تیز خوشبو اور مدراسی ریکارڈوں کی ہچکولے کھاتی آوازیں، دھوتیوں، سفید قمیض پتلونوں اور پاجاموں میں ملبوس کالے کالے دبلے لوگ ----- گاڑی اشرف سرائے کے باہر کھڑی ہو گئی۔ یہ سرائے ایک دو منزلہ پختہ بلڈنگ تھی۔ جس کے دروازے کے اندر گاڑی چلی جاتی تھی۔ میں نے گاڑی بان کو پیسے دیئے اور سوٹ کیس اٹھا کر سرائے میں آ گیا۔ دفتر میں میز کے پاس بچھی ہوئی چارپائی پر ایک ناٹے قد کا گٹھے ہوئے جسم والا ادھیڑ عمر آدمی لیٹا حقہ پی رہا تھا۔ اس کا رنگ سانولا تھا اور چہرا گھنی پھیلی ہوئی داڑھی میں چھپا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ شخص اسی سرائے کا مالک ہے اور اس کا نام مولوی کبیریا ہے۔ یہ شخص میرٹھ کا رہنے والا تھا۔ لیکن چودہ برس سے مدراس میں مقیم تھا اور یہ سرائے چلا رہا تھا۔ اس نے مجھ سے اسی وقت دو باتیں کیں اور پانچ روپے رکھوا لئے۔ نوکر کو آواز دے کر بولا:

"بھولا------ صاب کو اوپر والی چالی میں لے جا۔"

اوپر والی چالی ایک تنگ سا کمرہ تھا۔ جس کی چھت کی ایک کڑی نیچے کو جھکی ہوئی تھی اور بازار کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے سارے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے۔ یہاں سے بازار کا نظارہ بخوبی کیا جا سکتا تھا۔ کبیریا نے دو روپے بستر کے ایک روپیہ چارپائی کا لیا اور آٹھ آنے پانی کے اور دو روپے بجلی کے رکھوا لئے۔ میں نے کہا:

"مگر میں تو زیادہ سے زیادہ دو روز یہاں رہوں گا۔"

مولوی کبیریا نے داڑھی میں پنجہ ڈال کر کہا:

"میاں لٹکا جا رہے ہو ٹیکہ لگے گا۔ پرمٹ بنے گا۔ سات روز تو صرف اسی کام میں لگ جائیں گے۔ لیکن گھبراؤ نہیں۔ میرا ایک ڈاکٹر یار ہے۔ میں تمہیں اس کے پاس لے چلوں گا۔ بس میاں منٹوں میں کام بن جائے گا۔"

دوسرے روز مولوی کبیریا مجھے اپنے ساتھ فورٹ والے علاقہ میں لے گیا۔ ہم مدراس کے ایگمور سٹیشن سے بجلی کی لوکل ٹرین میں ایک آنے کا ٹکٹ لے کر سوار ہوئے اور

مورنٹ سٹیشن پر جا کر اتر گئے۔ مختلف بازاروں میں سے ہو کر ہم دونوں ایک بلڈنگ میں آ گئے۔ جہاں چاروں طرف مدراسی عورتیں زمین پر بیٹھی بیڑیوں کے پتے چھانٹ رہی تھیں۔ یہاں ایک کمرے میں مولوی صاحب کے دوست ڈاکٹر کا مطب تھا۔ پتلے دبلے مکروہ صورت لمبے لمبے دانتوں والے ڈاکٹر نے مجھے اس طرح دیکھا جس طرح قصاب مذبح میں داخل ہونے والی بھیڑ کو دیکھتا ہے۔ اس نے مجھے ٹیکہ لگایا اور بولا:

"دو روز بعد دوسرے بازو پر بھی لگے گا۔"

ہم واپس آ گئے مولوی کبیریا نے کہا:

"ابھی پیسے دینے کی ضرورت نہیں۔"

میرا بازو دو روز تک درد کرتا رہا۔ میں ایک روز تو سارا وقت سرائے والے کمرے میں چارپائی پر پڑا رہا۔ دوسرے روز باہر نکل آیا۔ ایک سڑک کو یونہی ایک طرف کو چل پڑا۔ کسی اجنبی ملک میں جو مزہ یونہی کسی سڑک پر چل پڑنے میں ہے وہ مزہ ماؤنٹ ایورسٹ کی مہم سر کرنے میں بھی نہیں۔ ہر چہرہ اجنبی ہے، کوئی آپ کو نہیں جانتا۔ آپ بھی کسی کو نہیں جانتے۔ سڑک کا ہر موڑ ایک بالکل ہی نیا اور پہلے کبھی نہ دیکھا ہوا منظر پیش کرتا ہے۔ ---------- اور کبھی نہ دیکھے ہوئے اور پھر کبھی دیکھے جانے والے چہروں کو گھڑی پل کے لئے سامنے لاتا ہے اور گم کر دیتا ہے۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ میں ایک ریستوران میں داخل ہو گیا۔ کاؤنٹر کے پیچھے ایک سفید پگڑی والا کالا مدراسی ماتھے پر گہرا سرخ تلک لگائے بیٹھا تھا۔ کاؤنٹر پر لوبان سلگ رہا تھا۔ دیواروں پر جگہ جگہ گنیش جی مہاراج کی تصاویر فریم ہو کر لگی تھیں۔ میں پتھر کی میز کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ ایک مدراسی چھوکرے نے آ کر مجھ سے پوچھا:

"کیا بولے گا بابو؟"

میں نے ہاتھ منہ کے پاس لا کر کہا:

"کھانا بولے گا۔"

لڑکا مسکراتا ہوا چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کیلے کا چوڑا پتا لا کر میرے سامنے میز پر بچھا دیا۔ پھر وہ ایک کیتلی اٹھا لایا۔ اس میں سے چمچ کی مدد سے چاول نکال کر پتے پر ایک طرف ڈال دیئے۔ دوسری مرتبہ اس نے دال لا کر ان پر ڈال دی۔ میں بت بنا اس لڑکے کی

Murtaza A. Siddiqui
mascom4u@gmail.com
NOVELS UPDATE STORIES

ہر حرکت کو دیکھتا رہا۔ اب اس نے سرخ مرچوں کی چٹنی لا کر رکھ دی۔ میں بیٹھے بیٹھے کانپ گیا۔ چار و ناچار کھانا شروع کر دیا۔ دال میں پہلے ہی سے مرچوں کا طوفان آیا ہوا تھا۔ ذرا سی چٹنی ساتھ لے کر کھائی تو اس نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ ناک آنکھ سے پانی بہنا شروع ہو گیا۔ روتے ہوئے اٹھا اور بل ادا کر کے روتا ہوا باہر سڑک پر آ گیا۔

اگلے روز مولوی کبیریا نے ساتھ لے جا کر اپنے خونخوار دانتوں والے ڈاکٹر سے پھر میرے بازو میں ٹیکہ لگوایا۔ اس کے تین دن بعد وہیں سے مجھے پرمٹ مل گئی۔ مولوی کبیریا نے پرمٹ میری جیب میں ڈالتے ہوئے کہا:

"تم سے کیا پردہ میاں ----- مسلمان آدمی ہوں۔ داڑھی کی ساتھ جھوٹ نہیں بول سکتا۔ ڈاکٹر نے پورے بیس روپے مانگے ہیں۔"

میں چکرا گیا۔ قریب تھا کہ مولوی کبیریا پر گر پڑوں کہ اس نے مجھے کمر سے پکڑ لیا۔

"حوصلہ کرو میاں ------ پچاس روپے کا کام تھا جو بیس روپے میں ہو گیا ------- مسلمان آدمی ہوں۔ داڑھی رکھ کر جھوٹ نہیں بول سکتا۔"

میں نے بادلِ ناخواستہ دل میں مولوی کبیریا کو ایک ہزار ایک گالیاں دے کر بیس روپے اس کے حوالے کر دیئے۔ سرائے میں آیا تو ایک مسافر نے جو کولمبو سے واپس آیا تھا۔ بتایا کہ مولوی کبیریا بڑا مکار اور دھوکے باز آدمی ہے۔ اس نے ڈاکٹر کو صرف پانچ روپے دیئے ہوں گے اور باقی پندرہ روپے اپنے جیب میں رکھ لئے ہوں گے۔ کیونکہ اس کا تو دھندا ہی یہی ہے۔

"اگر تم یہاں سے سیدھے سرکاری دفتر میں چلے جاتے تو دو روپے میں تمہیں ٹیکہ بھی لگ جاتا اور پرمٹ بھی مل جاتی۔"

لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ مولوی کبیریا کی چڑیاں میرا کھیت چگ گئی تھیں۔ میں صرف اتنا ہی کر سکا کہ مولوی کبیریا کے دیئے ہوئے بستر کی ایک سفید چادر سوٹ کیس میں چھپا کر ساتھ لے آیا۔ اس چوری نے مجھے بڑا ذہنی سکون دیا۔

میں ٹیکسی میں بیٹھ کر سٹیشن گیا ایک تو مدراس میں ٹیکسی سستی سواری تھی اور دوسرے اس سے پہلے کہ مولوی کبیریا کو چادر کی گمشدگی کا علم ہو۔ میں سٹیشن کے ہجوم میں گم ہو جانا چاہتا تھا۔ مدراس کے دوسرے بڑے سٹیشن کلیان پر دھنش کوڈی جانے والی گاڑی

تیار کھڑی تھی۔ دھنش کوڈی ہندوستان کی تکون کا آخری سٹیشن تھا۔ یہاں سے مجھے براہ راست کولمبو کا ٹکٹ مل گیا۔ گاڑی میں یہاں بھی کافی رش تھا۔ جانے ہمارے ملک کی گاڑیوں میں انتارش کیوں ہوتا ہے۔ ہر ٹرین کو دیکھ کر یہی احساس ہوتا ہے کہ شہر کی آبادی شہر چھوڑ کر باہر بھاگی جا رہی ہے۔ اور شہر میں آؤ تو معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے شہروں کے لوگ بھی یہاں آن بسے ہیں۔

بہر حال مجھے تھرڈ کلاس کے جس ڈبے میں جگہ ملی وہاں دوسرے لوگوں کے علاوہ تین سر منڈھی گیروے کپڑوں والی بڈھی بھکشین بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان تین عورتوں میں سے ایک سگار پی رہی تھی اور باقی دو پان چبا رہی تھیں۔ تینوں کی چندیا چمک رہی تھیں اور آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ مزدور قسم کے مدراسی پھنگی اور قرنگی جنہوں نے تیل بھرے کالے سیاہ گھنگریالے بالوں کو کھینچ کر پیچھے چٹیا سی بنا رکھی تھی۔ پسینوں کی بو اڑاتے کچر کچر باتیں کر رہے تھے اور جگہ جگہ پان کی تھوک پھینک رہے تھی۔ ڈبے میں برسات کی وجہ سے بڑا حبس تھا اور گرمی ناقابلِ برداشت ہو رہی تھی۔

ٹھیک وقت پر گاڑی نے وسل دیا اور گارڈ کی سیٹی پر پلیٹ فارم پر سے آگے کی طرف کھسکنے لگی۔ جب ٹرین سٹیشن سے باہر نکل آئی تو میری جان میں جان آئی کیونکہ مجھے ابھی تک مولوی کبیریا کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ کیا خبر وہ پولیس لے کر وہاں آ جائے اور میرے سوٹ کیس میں سے اپنی چادر برآمد کر لے۔ انتقامی طور پر میں نے اس کی چوری تو کر لی تھی، لیکن اب اپنی عزت کا خیال آ رہا تھا۔ بہر حال بلا سر سے ٹل گئی اور گاڑی فراٹے بھرتی مدراس شہر کی مضافاتی عمارتوں، بنگلوں، کوٹھیوں، اور پھل دار باغات کو پیچھے چھوڑتی دھنش کوڈی کی طرف اڑی جا رہی تھی۔

شہر پر شہر آئے اور گذرتے چلے گئے۔ کچھ مسافر اترے کچھ مزید ڈبے میں آن بیٹھے۔ مگر ان سب کی وضع قطع لباس اور بول چال ایک جیسی تھی۔ پتھروں کی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ پان پر پان کھاتے تھے اور بیڑیوں پر بیڑیاں پیتے تھے۔ سبھوں کے رنگ کالے تھے اور آنکھیں سپیروں کی مانند سرخ تھیں۔ تنجور آیا جہاں کے بڈھی سندر مشہور ہیں۔ مدورا آیا۔ جہاں کی عورتوں کی آنکھیں شربتی ہوتی ہیں اور بال ایڑی تک پہنچتے ہیں۔ اس اسٹیشن پر مدراسی لوگ ہر ڈبے کی کھڑکی میں منہ ڈال کر مدراسی اور انگریزی زبان میں کہتے کہ رامیشورم کے

NOVELS URDU STORIES Murtaza A. Siddiqui murtaza4u@gmail.com

مشہور تاریخی مندروں کی زیارت کرنے والے یہاں اتر پڑیں۔

ترچناپلی کے سٹیشن پر گاڑی آدھ گھنٹہ رُکی رہی۔ یہ شہر جو مندروں اور درسگاہوں کے لئے مشہور ہے۔ اس راستے کا سب سے بڑا شہر تھا۔ بہت خوبصورت سٹیشن تھا۔ جس کے پلیٹ فارم ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے اوپر سے گذر گئے تھے۔ یہاں مدراس ایسی خوبصورت تیکھے نین نقش والی سانولی لڑکیاں دیکھنے میں آئیں جن کے جوڑوں میں سفید پھول لگے تھے اور ناک اور کان کے زیوروں میں سبز پتھر چمک رہے تھے۔ میں ڈبے سے باہر نکل آیا تھا اور سگریٹ سلگائے پلیٹ فارم پر ٹہل رہا تھا۔ ایک لڑکی نے سامنے والے پلیٹ فارم کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے مجھے ایک پل کے لئے گھور کر دیکھا۔ اس نے کالے بارڈر والی سرخ ساڑھی پہن رکھی تھی۔ جسم بڑا نازک تھا اور رنگ سانولا تھا۔ جوڑے میں موتیے کے کھلے ہوئے پھول لگے تھے اور ناک کے کیل میں سرخ رنگ جھلملا رہا تھا۔ پاؤں میں چمڑے کی سیاہ چپل تھی۔ اس نے یوں دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ یا پہچان لیا ہو اور اب وہ حیرت سے پوچھ رہی ہو کہ تم یہاں کیسے نکل آئے میں بھی اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس نے آنکھیں دوسری طرف کر لیں اور پُل پر سے گذرنے لگی پُل کے آخری کنارے پر جا کر اس نے ایک بار پھر پلٹ کر دیکھا اور میری نگاہوں سے غائب ہو گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ مسکرا دی ہو۔ اس کے بعد میں اس لڑکی کو کبھی نہیں دیکھ سکا اور شاید زندگی میں پھر کبھی اسے نہیں دیکھ سکوں گا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس لڑکی کا دلکش چہرہ اور میری طرف گھورتی ہوئی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں میں کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔ اگر میں بوڑھا ہو کر مرا تو بستر مرگ پر اس لڑکی کو یاد کر کے میری آنکھوں سے ضرور آنسو نکل آئیں گے اور مجھے یوں محسوس ہو گا جیسے میں نے کل ہی اس لڑکی کو ترچناپلی کے سٹیشن پر دیکھا ہو۔ ایسی کتنی ہی دلکش چہروں اور جادو گر آنکھوں والی لڑکیاں ہیں جو اس وقت اس ملک کے ہر بڑے شہر، شہر کے ہر گلی کوچے کے مکان میں بیٹھی گھر کا کام کاج کر رہی ہیں۔ بھائیوں کو سلا رہی ہیں۔ اسکول کی طرف جا رہی ہیں۔ اپنے محبت کرنے والوں کے انتظار میں بس سٹاپ پر بے چینی سے کھڑی ہیں۔ لیکن ہم انہیں نہیں جانتے وہ ہمیں نہیں جانتیں۔ ہم نے ایک دوسرے کو کبھی نہیں دیکھا۔ ہم ایک دوسرے کو اس زندگی میں کبھی نہیں دیکھیں گے اور اسی دوری اور جدائی میں مر جائیں گے اور کسی کو کسی کی خبر نہیں ہو گی۔ یہ کتنی ناگزیر اور کتنی افسوناک حقیقت ہے۔ کیا ایسا

نہیں ہو سکتا کہ دنیا کا ہر آدمی دنیا کے ہر آدمی کو ملے بغیر کبھی اس دنیا سے رخصت نہ ہو؟

ترچناپلی سٹیشن پر سے ایک نوجوان میرے ڈبے میں آ کر میرے پاس بیٹھ گیا۔ ہم نے بہت جلد ایک دوسرے سے باتیں شروع کر دیں۔ گاڑی اپنے سفر پر روانہ ہو گئی۔ اس لڑکے کا نام کرشن تھا اور وہ ترچناپلی میں تیزاب کے کارخانے میں ملازم تھا اور اپنی بیمار ماں کی مزاج پرسی کے لئے کارتیکا جا رہا تھا۔ کارتیکا ترچناپلی سے سات گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ ہمارے ڈبے میں ایک تلک دھاری سادھو بھی آن بیٹھا تھا۔ کرشن نے مجھے بتایا کہ یہ سادھو مُنبر منیم ہے۔ کنیر گام میں شویٹے کندا سوامی کا بہت بڑا مندر ہے۔ کندا سوامی کے بھگتوں کو تامل میں مُنبر منیم کہتے ہیں۔

میں نے کہا۔

"خدا کرے کہ تیری ماں اچھی ہو جائے۔"

در اصل مجھے اپنی ماں یاد آ گئی تھی۔ جو بے چاری امرتسر میں بیٹھی مجھے یاد کر رہی ہو گی۔ میں نے تو اسے بھی خبر نہیں کی تھی کہ میں جا رہا ہوں۔ میں نے اسی وقت دل میں فیصلہ کر لیا کہ کولمبو پہنچ کر سب سے پہلے میں والدہ کو اپنی خیریت کا خط لکھوں گا۔ کرشن کی مسکراہٹ بڑی دل میں اثر کرنے والی تھی۔ اس نے افسردگی سے مسکرا کر کہا:

"بھگوان میری ماتا جی کی رکھشا کریں گے۔ ماتا جی کو مجھ سے بڑا پیار ہے۔ میں بھی ان سے بڑا پیار کرتا ہوں۔ میں ہفتے میں ایک بار ضرور گھر جا کر ماتا جی سے مل آتا ہوں۔ نوکری جو ہوئی کیا کروں۔ مجبوری ہے جوان بہن کی شادی کرنی ہے۔ پتا جی بوڑھے ہو گئے ہیں اور بیمار رہتے ہیں۔ چھوٹا بھائی اسکول میں پڑھتا ہے۔"

کارتیکا کا سٹیشن کہیں رات کو آیا۔ کرشن نے میرا کندھا ہلا کر مجھے جگا دیا اور ہاتھ جوڑ کر بولا:

"نمستے دوست! میں جا رہا ہوں۔"

میں نے نیند بھری آنکھیں کھول دیں اور ہاتھ جوڑ دیئے۔

"نمستے کرشنن! بھگوان تیری ماتا جی کو اچھا کریں۔"

کرشنن نے ہاتھ جوڑ کر سر جھکا کر نمستے کیا اور نیچے پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ اس کے بعد میں نے اس بھولے بھالے لڑکے کو پھر کبھی نہیں دیکھا۔ جو ماں کی محبت میں سرشار تھا اور

Murtaza A. Siddiqui
nascom4u@gmail.com
NOVELS UPDATES

جس کا دنیا میں سوائے ماں کے اور کوئی نہیں تھا۔

دوسرے روز گاڑی منڈاپم کیمپ پہنچ کر رک گئی۔ معلوم ہوا کہ کولمبو جانے والے مسافروں کو یہاں ٹیکے لگائے جائیں گے۔ تو کیا مدراس والے خونخوار ڈاکٹروں کے ٹیکے فراڈ تھے؟ میرے ایک ساتھی مسافر نے کہا:

"ادھر کا ٹیکہ ایک دم کنڈم۔ ایدھر جو ٹیکا لگتا ہے وہ سرکاری ہوتا ہے۔ اس کا پرچی ملتا ہے بابو۔"

منڈاپم کیمپ بڑی ہی بدوضع خشک اور بور جگہ تھی۔ اب اس گاڑی میں زیادہ تر کولمبو جانے والے مسافر ہی سوار تھے۔ منڈاپم کا سٹیشن معمولی سا تھا۔ اِدھر اُدھر آبادی کا کہیں بھی نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ دور دور کچھ جھونپڑیوں کی قطاریں نظر آ رہی تھیں۔ چاروں طرف ریتلے میدان تھے۔ جس کے ٹیلوں پر کہیں کہیں ناریل اور تاڑ کے جھکے ہوئے درخت کھڑے سمندر کی طرف سے آنے والی ہوا میں لہرا رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہاں سے سمندر قریب ہی ہے۔ گویا ہم لوگ ہندوستان کی جنوبی تکون کے آخری سرے پر پہنچ گئے تھے۔ گارڈ اور محکمہ کے لوگ ہم مسافروں کو ہنکا کر بکریوں کی طرح ایک ٹین کی اونچی چھت والے برآمدے میں لے گئے۔ یہاں کھانے پینے کو بھی کچھ نہیں مل رہا تھا۔ کونے میں صرف ایک نل لگایا تھا، جس میں سے گرم پانی باہر نکل رہا تھا۔ دھوپ بڑی تیز تھی اور گرم ہوا چل رہی تھی۔ برآمدے کی ٹین کی چھت تپ رہی تھی۔ کوئی آدھ گھنٹہ کسمپرسی کے عالم میں یہاں بیٹھے رہنے کے بعد ایک کالا بھجنگ مکروہ صورت مدراسی ڈاکٹر آیا اور اس نے کرسی پر بیٹھ کر باری باری مسافروں کو ٹیکہ لگانا شروع کر دیا۔ وہ بڑی بے نیازی اور بے دردی سے سرنج کی سوئی بازو میں گھونپ دیتا اور پھر ایک پرچی پر مسافر کا نام لکھ کر اپنے دستخط کرتا اور پرچی تھما دیتا۔ کوئی دو گھنٹے کے بعد یہاں سے چھٹکارہ نصیب ہوا۔ اس دوران مولوی کبیریا کی چرائی ہوئی چادر فرش پر بچھا کر اس پر آلتی پالتی مارے بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا اور مولوی کبیریا کے ڈاکٹر کو کوستا رہا۔

خدا خدا کر کے لوگ ٹرین میں سوار ہوئے اور گاڑی منڈاپم کیمپ سے آگے کو روانہ ہوئی۔ اب زیادہ تر میدان ریتلے تھے۔ کھیتوں اور سرسبز جنگلات کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ لیکن ناریل اور تاڑ کے درخت کہیں کہیں ضرور دکھائی دے جاتے تھے۔ گاؤں گذرتے جو چند ایک

جھونپڑوں پر مشتمل ہوتے۔ ان جھونپڑیوں کے باہر ننگ دھڑنگ کالے کالے غربت کے مارے لڑکے بھاگ کر گاڑی کی طرف آتے اور پھر ریت کے ٹیلے پر کھڑے ہو کر ریل کا تماشہ کرنے لگتے۔

کوئی دو گھنٹے بعد بائیں طرف کو سمندر دکھائی دینے لگا۔ سمندر کا رنگ گہرا سبز تھا اور گاڑھے موبل آئل کی یاد تازہ کر رہا تھا۔ سمندر آہستہ آہستہ قریب سے قریب تر آ رہا تھا۔ سمندر میں سے ایک بڑی سی جھیل نکل کر میدان میں آ گئی تھی۔ اس پر ریلوے والوں نے پتھر ڈال کر پل بنا دیا تھا۔ یہ پل کوئی ایک میل لمبا تھا۔ جب گاڑی اس پر سے گذری تو وہ منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ کیونکہ ایک طرح سے گاڑی سمندر پر سے گذر رہی تھی۔ پانی کا وہی گہرا سبز رنگ تھا اور اس کی بڑی بڑی لہریں بھورے رنگ کے پتھروں سے ٹکرا کر جھاگ اڑا رہی تھیں۔ سب مسافر کھڑکیوں پر جھک کر اس نظارے سے لطف اندوز ہونے لگے۔ پل پر سے گذر کر گاڑی پھر ریتلے میدان میں دوڑنے لگی۔ گاڑی کی رفتار ہلکی ہو گئی تھی۔ کیونکہ ایک تو لائن ریت پر بچھی ہوئی تھی۔ دوسرے یہاں موڑ بہت آ رہے تھے۔ اب خلیج بنگال اور بحیرہ عرب کے سمندروں کا پانی صاف نظر آ رہا تھا۔ بائیں طرف کو وسیع و عریض سمندر پھیلا ہوا تھا۔ ہندوستان کی تکون کا آخری سٹیشن دھنش کوڈی آ گیا تھا۔ گاڑی ایک معمولی سے بغیر پلیٹ فارم کے سٹیشن پر کھڑی ہو گئی۔ میں نہ دیکھا کہ پاس ہی سمندر میں ایک چھوٹا جہاز کھڑا ہے۔ ہمیں اب ریل میں سے اتر کر اس جہاز میں سوار ہونا تھا۔ اس جہاز نے خلیج بنگال اور بحیرہ عرب کے ملے ہوئے سمندر کو عبور کر کے لنکا کے جزیرے میں داخل ہونا تھا۔ جہاز پر سوار ہونے سے پہلے ہمیں لائن کے پار قطار بنا کر کھڑا کر دیا گیا اور کسٹم والوں نے ہمارے سامان کی تلاشی لی۔ پرمٹ اور ڈاکٹری سرٹیفکیٹ چیک کیے۔ ان رسمات سے فارغ ہو کر ہمیں جہاز پر سوار ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ مزدور مسافروں کا سامان اٹھا کر خچروں کی طرح جہاز کی طرف اٹھ دوڑے۔ ہر طرف ایک بھگدڑ سی مچ گئی تھی۔ میں نے بھی اپنا سوٹ کیس ایک قلی کے سر پر رکھوایا اور گینگ وے پر سے گذر کر جہاز کے عرشے پر آ گیا۔ اس جہاز کی تھرڈ کلاس عرشے کے نیچے پہلی منزل میں تھی۔ یہاں اس قدر گرمی، حبس اور اندھیرا تھا کہ دم نکلا جا رہا تھا۔ میں نے سوٹ کیس ایک مارواڑی سیٹھ کے حوالے کیا اور خود ڈیک پر

NOVELS URDU STORIES
Murtaza A. Siddiqui
mas4u@gmail.com

آ گیا جو دراصل صرف سیکنڈ کلاس کے مسافروں کے لئے وقف تھا۔ ٹکٹ چیکروں کی نظر سے بچنے کے لئے جہاز کے لانج میں آ کر بیٹھ گیا اور چائے پینے لگا۔ اس چھوٹے سے جہاز کا نام ٹمپل تھا۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد اس نے گھگو دیا اور اس کا لنگر اٹھا دیا گیا اور جہاز سمندر میں جیٹی سے پیچھے ہٹنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کھلے سمندر میں تھا اور جزیرہ لنکا کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا۔ جس وقت ہندوستان کا ساحل نظروں سے بالکل اوجھل ہو گیا ادھر سے لنکا کے ساحل کے درختوں کی چوٹیاں نظر آنا شروع ہو گئیں۔ دن ڈھل رہا تھا۔ دھوپ کی حدت کم ہو گئی تھی۔ اور آسمان پر سیاہ بدلیوں کے قافلے چل نکلے تھے۔ ٹھیک پون گھنٹے کے بعد ٹمپل نامی جہاز کا لنگر سمندر مین ڈال دیا گیا۔ ملاحوں نے موٹے موٹے رسے اچھال کر جیٹی پر پھینک دیئے۔ کسٹم والوں نے جہاز میں آ کر مسافروں کے سارے سامان کو ٹھونک بجا کر دیکھا۔ تب کہیں جا کر سیڑھی لگی اور ہم لوگ قلیوں کے ہجوم کو چیرتے نیچے اتر آئے لنکا کی سرزمین میں اتر کر میں نے گہرا سانس لیا اور محسوس کیا کہ فضاء میں اُسی سمندری ہوا کی مرطوب بو رچی ہوئی ہے جو مجھے بلانے اس رات یہاں سے چل کر امرتسر آئی تھی۔ سامنے ہرے بھرے جنگل کا سلسلہ نظر آ رہا تھا۔ جس میں ناریل اور تاڑ کے درختوں کے جھنڈ سر نکالے جزیرے کی ہوا میں لہرا رہے تھے۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر ان درختوں کو سلام کیا اور سوٹ کیس قلی کے سر پر رکھوا کر اس چھوٹی لائن کی سبز گاڑی کی طرف چل پڑا جو کولمبو جانے کے لئے ذرا سے فاصلے پر تیار کھڑی تھی۔

(2)

شام ہو گئی تھی جب کولمبو ایکسپریس تالی ینار سے چلی۔

رات بھر گاڑی لنکا کے جزیرے کے گھنے جنگلوں میں سے گذرتی رہی میں برتھ پر اوپر چڑھ کر سو گیا۔ مجھے دو ٹرنکوں کے درمیان تھوڑی سی جگہ مل گئی تھی ..... باقی جگہ میں نے پاؤں سے ٹرنک کو کھسکا کھسکا کر بنالی۔ جب سے امرت سر سے گاڑی میں سوار ہوا تھا اچھی طرح سو نہ سکا تھا۔ یہاں جو ذرا لیٹنے کو جگہ ملی تو گھوڑے بیچ کر سو گیا۔ صبح تک سوتا رہا۔ جس وقت اٹھا باہر دن نکل آیا تھا۔ بارش ہو رہی تھی۔ کنول کے پھولوں سے بھری ہوئی جھیلیں اور بانس کے گھنے جنگل گذر رہے تھے۔ گاڑی ویسے تو چھوٹی تھی مگر بڑی تیز رفتاری سے اڑی چلی جا رہی تھی۔ اس نے تو فرنٹئیر میل اور مدارس ایکسپریس کو نیچا دکھا دیا تھا۔ عجیب عجیب ناموں والے سٹیشن آ رہے تھے۔ اور گذرتے جا رہے تھے۔ ایک سٹیشن پر گاڑی رکی بارش تھم گئی تھی۔ لڑکیاں لکڑی کی تختیوں پر سجے ہوئے کیلوں میں انناس کے قتلے پھنسائے ہمارے ڈبے کی طرف آئیں۔

"پائین ایپل سر!"

میں نے ایک "قتلہ" خرید لیا۔

"ایک سینٹ سر!"

تالی ینار میں ہمیں کرنسی بدل دی گئی تھی۔ ایک سینٹ اکنی کے برابر تھا۔ لنکا میں اکنیوں کی جگہ سینٹ چلتے تھے۔ روپیہ ویسے کا ویسے ہی تھا اور نوٹ بھی ہندوستان کے نوٹوں ایسے ہی تھے۔ میں نے ایک سینٹ ادا کر دیا اور لنکا کی اس خوبصورت بیٹی کو دیکھتا رہ گیا۔ اس نے سفید دھوتی کس کر باندھ رکھی تھی۔ جس میں سے اس کے کولھوں کے خم باہر جھانک رہے تھے۔ اوپر والے حصے پر صرف ایک انگیا ہی تھی۔ پیٹ بڑا صاف اور ملائم تھا۔ سیاہ بالوں کا جوڑا بنا ہوا تھا۔ جس میں کنول کا پھول کان کے اوپر دائیں جانب نیچے کو لٹک رہا تھا۔

"پائین ایپل سر؟"

Murtaza A. Siddiqui
mascom4u@gmail.com
NOVELS URDU

لڑکی دوسرے ڈبے کی جانب بھاگ گئی اور میں اناناس کی خوشبو لیتا اس کا میٹھا رس حلق میں انڈیلتا ویسے ہی کھڑا رہا۔ انجن نے سیٹی دی میں اچک کر ڈبے میں سوار ہو گیا۔ اور گاڑی روانہ ہو گئی۔ ہر سٹیشن کے پلیٹ فارم پر سرخ بجری بچھی تھی اور لوہے کے جنگلے کے اوپر سرخ پھولوں سے لدے ہوئے درختوں کی قطاریں جھکی ہوئی تھیں۔ گاڑی ایک بار پھر پہاڑیوں کا چکر کاٹتی بانس کے گھنے جنگلوں اور دھان کے کھیتوں کے طویل سلسلوں میں سے گذر رہی تھی۔ اتنے گنجان جنگل میں نے پہلے کہیں نہیں دیکھے تھے۔ تاریک جنگلوں کے بیچوں بیچ گہری سبز پر سکون جھیلوں پر کنول کے سپید اور کاسنی پھول کھل رہے تھے۔ کھیتوں میں سیلونی عورتیں اپنے مردوں کے ساتھ دھان کی بوائی کر رہی تھیں۔ کہیں کیلے کے درختوں میں زرد کیلوں کے گچھے کے گچھے لٹک رہے تھے۔ کہیں پانوں کے کھیت چلے گئے تھے۔ کہیں پہاڑوں کی ڈھلانوں پر عورتیں جھولے پیچھے لٹکائے چائے کی پتیاں چن رہی تھیں۔ دو ایک دریا بھی گذرے جن کا نام مجھے یاد نہیں۔ ان کے اوپر بنے ہوئے پل کاریگری کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ دن کے کوئی گیارہ بجے کے قریب گاڑی کولمبو پہنچ گئی۔

کولمبو میں کولمبو نام کا کوئی ریلوے سٹیشن نہیں۔ کولمبو کے دو بڑے سٹیشن ہیں۔ ایک کا نام مروانہ اور دوسرے سٹیشن کا نام فورٹ ہے۔ ہماری گاڑی مروانہ سٹیشن پر آ کر رکی۔ سنہالی لوگ مدراسیوں کی طرح کے چھوٹے قد، سیاہ رنگت، دبلے پتلے، اور کمزور صورت -------- سفید دھوتیاں، سفید پتلونیں، سیاہ چپلیں، چھتریاں اور بیشتر پاؤں سے ننگے ---- ریلوے کے ملازموں کا بھی یہی لباس تھا۔ سفید کوٹ، سفید دھوتی اور سیاہ چپل ----- سٹیشن بڑا خوبصورت اور جدید وضع کا تھا۔ پلیٹ فارم کشادہ اور چھت اونچی تھی۔ اسے دیکھ کر بمبئی کا سنٹرل سٹیشن یاد آ گیا۔ سنہالی عورتیں جو اپنے اپنے رشتہ داروں کو لینے آئی تھیں، اپنی قسم کی الگ خوبصورتی کی مالک تھیں۔ ان کے رنگ کھلتے ہوئے تھے۔ چہرے گول گول تھے۔ بری عورتوں کی طرح رنگدار دھوتیوں کے اوپر ریشمی صدریاں پہن رکھی تھیں اور سیاہ چمکیلے بالوں میں سفید یا سرخ پھول لگے ہوئے تھے۔ بعض عورتوں نے بھڑکیلے رنگوں والی ساڑھیاں زیب تن کر رکھی تھیں۔ ان کے مقابلے میں مرد کمزور اور غیر پر کشش شخصیت کے نظر آ رہے تھے۔ میں نے ایک بار پھر اپنا سوٹ کیس باہر نکالا اور ایک شخص کو سوٹ کیس اٹھانے کو کہا۔ اُس شخص نے قہر بھری نظروں سے میری طرف دیکھ کر

کہا:

"مسٹر میں قلی نہیں ہوں، میں ٹکٹ چیکر ہوں، اپنا ٹکٹ دکھاؤ۔"

میں تو حیران رہ گیا۔ جلدی سے ٹکٹ نکال کر اسے دکھایا۔ اس نے ٹکٹ پر پنسل سے نشان لگایا اور مجھے گھورتا ہوا چلا گیا۔ یہاں قلیوں اور ٹکٹ چیکروں میں بہت کم فرق تھا۔ ---------- قلیوں کی کوئی خاص وردی نہ تھی۔ اب میں کسی قلی کو پکارتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ کیا خبر وہ سٹیشن ماسٹر نکل آئے۔ خدا کا شکر ہے کہ ایک قلی خود آ گیا اور میرا سوٹ کیس اٹھا کر باہر لے آیا۔ باہر آ کر میں نے دیکھا کہ بہت بڑا چوک ہے، جہاں بجلی کی بسیں، ٹرامیں، اور موٹریں آگے پیچھے بھاگی جا رہی ہیں۔ بارش ہونے کو تھی کہ لنکا دیش کے باشندے چھتریاں کندھوں پر لٹکائے تیز تیز قدموں سے فٹ پاتھ پر چلے جا رہے تھے۔ ایک ٹیکسی والا میرے پاس آ کر انگریزی میں بولا:

"ہوٹل چلے گا بابو؟"

یہاں انگریزی اور ہندوستانی ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ میں نے سوچا یہاں کوئی واقف کار نہیں ہے۔ پہلے ہوٹل میں ہی چلنا چاہیئے۔ وہاں جا کر کوئی پکا بندوبست کیا جائے گا۔ چنانچہ میں ٹیکسی میں سوار ہو گیا۔ میں نے ڈرائیور سے مل کر اس بات کا پوری طرح اطمینان کر لیا تھا کہ ہوٹل درمیانے درجے کا ہو اور اس کے اخراجات زیادہ نہ ہوں۔ ٹیکسی مجھے کولمبو شہر کی خوبصورت سڑکوں کی سیر کرواتی ہوئی ایک ہوٹل میں لے آئی۔ یہ ہوٹل معمولی سی عمارت میں واقع تھا۔ کئی روز کے سفر کا تھکا ہارا تھا۔ کمرے میں آتے ہے کھانا کھا کر سو گیا اور شام تک سوتا رہا۔ شام کو اٹھ کر نہایا کپڑے تبدیل کئے اور شہر کی سیر کو نکل گیا۔ کولمبو کی حسین سڑکوں پر روشنی ہو رہی تھی۔ بڑی بڑی عمارتوں میں بتیاں جگمگا رہی تھیں۔ کچھ دور تک میں یونہی آوارہ گردی کرتا پھرا۔ میرے راستے میں دو سینما گھر بھی آئے۔ یہاں ایک جگہ سنہالی فلم اور دوسری جگہ انگریزی فلم چل رہی تھی۔ چونکہ مجھے سڑکوں سے ابھی پوری طرح واقفیت نہیں تھی۔ اس لئے جلدی ہی واپس ہوٹل آ گیا اور کمرے میں آ کر کھانا کھانے کے بعد سو گیا۔

اگلے روز صبح اٹھا اور ناشتہ کرنے کے بعد لوگوں سے پوچھتا پیٹہ کے علاقے میں آ گیا۔ یہ کولمبو کا کاروباری علاقہ تھا اور لاہور کی اکبری منڈی کی طرح گنجان اور گندہ تھا۔ دراصل یہ

NOVELS URDU LIBRARY Murtaza A. Siddiqui murtaza4u@gmail.com

کولمبو کا پرانا شہر تھا۔ اس جگہ میں نے راون کے زمانے کے بت اور کھنڈرات دیکھے۔ یہاں بوسیدہ اور تنگ و تاریک عمارتیں تھیں جن کے ایک ایک فلیٹ میں چار چار کنبے آباد تھے۔ یہ کاروباری علاقہ تھا اور شہر کے سارے غلے اور اجناس کا کاروبار یہاں ہوتا تھا۔ یہاں سبزی منڈی تھی۔ گھاس منڈی تھی۔ میوہ منڈی تھی۔ غلہ منڈی تھی، صرف ہیرا منڈی نہیں تھی۔ جس کا مجھے بے حد افسوس ہوا۔ ان ساری منڈیوں پر ہندوستانیوں اور بیشتر مسلمانوں کا قبضہ تھا۔ ان میں مدراسی، بنگالی اور سیلونی مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی۔ یہاں میں جبار حاجی نامی غلے کے ایک اچھے خاصے تاجر سے ملا۔ داڑھی مونچھ صفا چٹ گورے رنگ کا یہ جوان آدمی پشاور کا رہنے والا تھا اور کوئی پندرہ برس سے کولمبو میں تجارت کر رہا تھا۔ غلے کے ساتھ ہی ساتھ وہ پھلوں کی آڑھت کا کام بھی کرتا تھا۔

جب میں نے اسے بتایا کہ مجھے کولمبو کی سیاحت کا شوق یہاں کھینچ لایا ہے اور میں نوکری کرنا چاہتا ہوں، تاکہ سیر و سیاحت کے ساتھ ساتھ پیٹ بھی پال سکوں تو اس نے مسکرا کر کہا:

"کوئی بات نہیں تم ہمارے بھائی ہو، ہم سے جو ہو سکے گا تمہارے لئے کریں گے۔"

اس نے مجھے اپنی دکان پر ڈیڑھ سو روپے ماہوار پر نوکر رکھ لیا۔ ساتھ دکان کے اوپر پندرہ روپے ماہوار پر ایک کمرہ بھی لے کر دے دیا۔ میں نے ہوٹل سے اپنا اکلوتا سوٹ کیس اٹھایا اور وہاں آ کر رہنے لگا۔ میرا کام سٹور میں جمع شدہ مال کی چیکنگ اور بیوپاریوں کو مال حوالے کرتے وقت ان کا حساب کتاب رکھنا تھا۔ دوکان میں حاجی جبار کا بہنوئی بھی تجارت میں برابر کا شریک تھا اور حاجی کے ساتھ ہی بڑی سی میز پر بیٹھتا تھا۔ یہ شخص کرنجی آنکھوں اور سنہری مونچھوں والا بھاری بھر کم آدمی تھا جو سنہری فریم کی عینک لگاتا۔ حاجی صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ کبھی کبھی شعر بھی کہتا ہے۔ اس کا نام انجم تھا۔ انجم بڑا باغ و بہار آدمی تھا اور مکان میں بیوپاریوں سے بڑی اونچی آواز میں باتیں کرتا اور بات بات پر قہقہے لگایا کرتا۔ کاروبار میں بڑا سیانا اور زیرک تھا۔ بیوپاریوں کو شعر سنا سنا کر خوش کیا کرتا اور کیا مجال جو ایک دھیلے کا مال زیادہ دیدے۔ حاجی صاحب کا منشی ایک بوڑھا مدراسی مسلمان تھا۔ جس کی داڑھی سفید تھی اور عینک کی ایک کمانی ٹوٹ گئی تھی۔ جہاں اس نے دھاگہ باندھ کر کان کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ یہ شخص انتہائی کم گو تھا۔ صرف دیکھتا تھا اور منہ سے کوئی بات نہ کرتا تھا۔

ایک ماہ تک کام کرنے کے بعد میں نے پہلی تنخواہ لی تو اس میں سے کرایہ اور ہوٹل کے کھانے کا بل کاٹ کر پچاس روپے والدہ کو امرتسر منی آرڈر کر دیئے اور ساتھ ہی تسلی کا خط بھی لکھ دیا۔

والدہ نے جو خط لکھا اس میں مجھے دعائیں دیں اور کہا کہ میں اداس ہوں پردیس میں نوکری کر کے تم جائیداد نہیں بنا لو گے۔ گھر آجاؤ گھر کی روکھی سوکھی بُری نہیں۔ کم از کم میری آنکھوں کے سامنے تو ہو گے۔ میں نے لکھا کہ میں ابھی لنکا کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔ ابھی امرتسر نہیں آؤں گا۔ ہماری مائیں تو سبھی ایسی ہی ہوتی ہیں۔ ان کا بس چلے تو عمر بھر ہمیں اپنے سے جدا نہ ہونے دیں۔ بے چاری مائیں۔ بیٹے تو ان کی جنت ہوتے ہیں۔ لیکن اس جنت کا انجام ہمیشہ افسوسناک ہوتا ہے۔ کسی بیٹے کو پردیس چھین کر لے جاتا ہے اور کسی کو بہو اڑا کر لے جاتی ہے۔ ماں کا تو صرف اتنا کام ہوتا ہے کہ لڑکی کو جوان کر کے داماد کے حوالے کر دے اور بیٹے کو پال پوس کر بہو کے حوالے کر دے اور خود چارپائی پر پڑ کر کھانس کھانس کر موت کا انتظار کرتی رہے۔

میں صبح آٹھ بجے دکان پر آجاتا۔ دوپہر تک کام کرتا۔ دوپہر کو ہوٹل میں کھانا کھاتا۔ پھر نوکری پر حاضر ہو جاتا اور شام پانچ بجے تک کام کرتا رہتا۔ اس کے بعد شہر کی سیر کرنے نکل جاتا۔ میں نے بس میں اور ٹرام میں سوار ہو کر شہر کا کافی حصہ دیکھ لیا تھا۔ شہر کا دوسرا حصہ بڑا خوبصورت اور دلکش تھا۔ شاندار بنگلے، بلند پختہ عمارتیں سینما گھر، چوڑی چکلی سڑکیں دلکش کشادہ بیچ، سمندر کا کنارہ، ناریلوں کا جھنڈ، گال روڈ جو بڑی کشادہ اور بے حد طویل تھی۔ اور سمندر کے ساتھ ساتھ کئی میل تک چلی گئی تھی۔ حاجی صاحب کی کوٹھی شہر سے باہر ایک بڑی ہی پُرفضا جگہ پر واقع تھی۔ لائن میں ناریل اور سرخ پھولوں والے درخت تھے۔ میں کبھی کبھی ان کی کوٹھی پر بھی جایا کرتا۔ حاجی صاحب کی بیوی بڑی ہنس مکھ اور اچھے سبھاؤ کی پٹھان عورت تھی۔ اس عورت کی چھوٹی بہن گل زیب بڑی خوبصورت اور دبلی پتلی گوزی چٹی لڑکی تھی۔ میں جو فطرتاً عاشق مزاج ہوں اور ہر لڑکی پر فوراً عاشق ہو جاتا ہوں۔ گل زیب پر بھی عاشق ہو گیا۔ میں نے اس سلسلے میں اُس لڑکی سے مشورہ کرنے کی تکلیف بھی گوارہ نہ کی اور بڑی گرمجوشی سے اس کے ساتھ عشق کرنے لگا۔ جب کبھی کوٹھی میں جاتا تو ٹکٹکی باندھ کر گل زیب کو دیکھتا اور جب وہ شرما کر نظریں جھکا لیتی تو بڑا خوش

NOVELS URDU STORIES Murtaza A. Siddiqui murtaza4u@gmail.com

ہوتا۔ کیونکہ میری منطق میں یہ محبت کا جواب تھا۔ لیکن اس کا کیا علاج وہ حاجی جبار خان کی سالی تھی اور خدا جبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ شاید حاجی صاحب بھی اسے پسند نہ کرتے۔ بعد میں پتہ چلا کہ لڑکی کو بھی یہ بات پسند نہیں تھی۔ ایک روز میں نے تنہائی میں موقع پا کر گل زیب سے عشق کا اظہار کر دیا۔ اُس لڑکی نے میری باتیں خاموشی سے سنیں اور پھر آنکھیں اٹھا کر بولی۔

"وصال صاحب! میں آپ کی عزت کرتی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس کا ذکر بھائی جان سے نہیں کروں گی۔ آپ براہِ مہربانی آئندہ ایسی حرکت کبھی نہ کریں۔"

مجھے گل زیب کی اس بات نے کوئی صدمہ نہ دیا۔ نہ ہی مجھے حیرت ہوئی۔ کیونکہ نفسیاتی طور پر ہر لڑکی سے عشق کرنے والا نوجوان ایک آدھ لڑکی کو یونہی چھوڑ سکتا ہے۔ میں نے بڑے ادب سے کہا۔

"گل زیب اگرچہ میرا نام وصال احمد ہے لیکن مجھے محبت میں وصال کبھی نصیب نہیں ہو سکتا۔ محبت میں میں ہجر بیگ ہوں۔ پھر بھی گل زیب تمہیں ایسی بے رخی زیب نہیں دیتی۔"

گل زیب کمرے سے باہر نکل گئی۔

اب مناسب یہی تھا کہ حاجی جبار کی نوکری چھوڑ دی جائے اور کسی دوسری جگہ قسمت آزمائی کی جائے۔ ویسے بھی نوکری کے لیے کولمبو نہیں آیا تھا۔ نوکری چاہیئے جہاں بھی مل جائے۔ مقصد تو یہ تھا کہ سیر و سیاحت کا خرچ چلتا رہے۔ دوسرے مجھے یہ ملازمت پسند بھی نہیں تھی۔ غلے کی منڈی میں رہ کر میں بھی غلہ بن گیا تھا۔ کسی وقت محسوس ہوتا کہ میں چنے کی دال ہوں۔ مونگ پھلی ہوں۔ پینگ ہوں۔ خربوزے کو دیکھ کر میرا خربوزہ بھی رنگ پکڑنے لگا تھا۔ میں نے شہر میں کچھ لوگوں سے واقفیت پیدا کر ہی لی تھی۔ چنانچہ کسی دوسری جگہ نوکری کی تلاش شروع کر دی۔ انجم صاحب کا شاعر ہونا میرے کام آ ہی گیا۔

جنگ ختم ہو چکی تھی لیکن جنوب مشرقی ایشیاء میں اتحادی فوجیں مقبوضہ علاقوں میں ابھی تک مقیم تھیں۔ ان کی تفریح طبع کے لئے ریڈیو سی ایک سیلون سے ہندوستانی میں ہر روز صبح اور شام کو تین گھنٹے پروگرام ہوا کرتا تھا۔ کبھی کبھی مشاعرہ بھی ہو جایا کرتا۔ ایک مشاعرے میں انجم صاحب گئے تو مجھے بھی ساتھ لیتے گئے۔ وہاں میری ملاقات اس ہندوستانی

پروگرام کے انچارج میجر حامد سے ہو گئی۔ میجر حامد امرتسر کے رہنے والے تھے اور کشمیری تھے۔ مجھ سے بڑے تپاک سے ملے اور پوچھا۔

"کونسا محلہ ہے آپ کا؟"

میں نے اپنے محلے کا نام لیا اور کہنے لگے۔

"بھئی ہم تو کٹڑہ کرم سنگھ میں رہتے ہیں۔"

اس کے بعد میں جب کبھی اُن سے ملا انہوں نے بڑی محبت کا اظہار کیا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میں کچھ لکھ لکھا بھی لیتا ہوں تو مجھ سے اصرار کرنے لگے کہ میں فوجیوں کے لئے بھی کوئی تفریحی پروگرام لکھ دیا کروں۔ ایک دو بار میں نے مزاحیہ فیچر بھی لکھے جو انہوں نے بہت پسند کئے۔ اب جو ادھر نوکری والا معاملہ گڑبڑ ہوا تو میں نے سوچا کیوں نہ میجر حامد سے مل کر بات کی جائے۔

چنانچہ میں نے فوراً انہیں فون کیا اور شام کا وقت لے لیا۔ شام کو میں ان کے دفتر ریڈیو سی ایک سیلون پہنچ گیا۔ یہ ریڈیو سٹیشن میونسپل ہال کی شاندار عمارت کے سامنے ایک خوبصورت کوٹھی میں واقع تھا۔ جس کے گیٹ پر ایک سنگین بردار فوجی پہرا دے رہا تھا۔ میں نے اُسے میجر حامد کا حوالہ دیا تو اُس نے گیٹ پوسٹ کے انچارج سے کہلوا کر ادھر فون کروایا۔ میجر حامد نے فون پر کہا کہ آنے دو اور میں گیٹ کے اندر داخل ہو گیا۔ میجر حامد اپنے دفتر کے کمرے میں بیٹھا اپنی سیکرٹری کو کچھ لکھوا رہا تھا۔ مجھے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔ میں بیٹھ گیا۔ سیکرٹری میرے سامنے بیٹھی تھی۔ بھرے بھرے جسم والی انگریز عورت تھی۔ اچھی خاصی شکل و صورت کی تھی۔ میں عاشق ہوتے ہوتے رہ گیا۔ کافی آنکھ سے اُسے برابر دیکھتا رہا۔ سانس لینے سے اس کے سینے کا ابھار آہستہ آہستہ اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ بال سنہری تھے اور ناک کی چونچ سرخ ہو رہی تھی۔ کاسنی رنگ کے ہلکے گاؤن میں تھی بازو ننگے تھے اور جس ہاتھ کو وہ میز پر ٹکا کر لکھ رہی تھی۔ اُس کی بغل میں سے سنہری بالوں کی ایک جھلک صاف دکھائی دے رہی تھی۔

جب سیکرٹری چلی گئی تو میجر حامد نے مجھے سگریٹ پیش کیا اور میرے آنے کا مقصد پوچھا۔

میں نے صاف صاف بات بیان کر دی کہ نوکری کرنا چاہتا ہوں۔ آٹے دال کا حساب

Murtaza A. Siddiqui
murtazascom4u@gmail.com
NOVELS URDU STORIES

کرتے کرتے تنگ آ گیا ہوں۔ یہاں رہ کر فوجیوں کے لئے کچھ لکھنا لکھانا چاہتا ہوں۔ میجر حامد مسکرایا اور بولا۔

"بڑی خوشی کی بات ہے۔ تم تو اچھا خاصا لکھ لیتے ہو اور ہمارے پاس لکھنے والوں کی پہلے ہی سے کمی ہے لیکن جیسا کہ تمہیں معلوم ہے یہ ایک فوجی ریڈیو سٹیشن ہے۔ یہاں میرا سارا سٹاف موجود ہے۔ مجھے تمہارے لئے خاص طور پر ہیڈ کوارٹر کو دہلی لکھنا ہو گا اور منظوری منگوانی ہو گی۔ تم کچھ دیر انتظار کرو میں آج ہی ہیڈ کوارٹر خط لکھے دیتا ہوں۔"

میجر حامد نے وعدہ کے مطابق اسی روز خط لکھ دیا۔ ایک ہفتے بعد اُس نے مجھے فون پر بلایا اور کہا کہ میں اُسے مل لوں۔ ملنے پر معلوم ہوا کہ ہیڈ کوارٹر نے مجھے ملازم رکھنے کی اجازت دے دی ہے۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ ایک تو آٹے دال سے نجات ملی تھی۔ دوسرے نوکری بڑی آسان تھی۔ تیسرے تنخواہ ساڑھے چار سو روپے ماہوار تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ دفتر شہر کے خوبصورت علاقے میں تھا۔ میں نے فوراً حاجی جبار خاں کے ہاں اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔ میں نے حاجی صاحب کو بتا دیا کہ مجھے ریڈیو سیلون میں نوکری مل گئی ہے۔ انہوں نے خوشی کا اظہار کیا اور مجھے اجازت دے دی۔

میں نے ریڈیو سیلون پر کام شروع کر دیا۔ دن کو دس بجے پہلے ٹرانسمیشن کے لئے آتا اور ایک بجے واپس چلا جاتا۔ شام کو چار بجے آتا اور چھ بجے کام ختم ہو جاتا۔ میرا کام ہر روز فوجیوں کی تفریح طبع کے لئے کوئی مزاحیہ خاکہ، کہانی، فیچر یا گیت مالا لکھنا تھا۔ شروع شروع میں کچھ دقت ہوئی لیکن کچھ دنوں بعد کام چل نکلا۔ ابھی میری رہائش حاجی صاحب کی دکان کے اوپر تھی۔ کچھ دنوں بعد میجر حامد نے اپنے اثر و رسوخ سے مجھے ایک جگہ کوٹھی میں پچاس روپے ماہوار پر ایک کمرہ لے دیا۔ یہ کوٹھی بوریا جنکشن میں واقع تھی۔ اس کا نام اولمس پیلس تھا اور یہ ایک ہالینڈ کی ادھیڑ عمر کی عورت مسز جونس کی ملکیت تھی۔ اس عورت کا خاوند سیلون ٹی کمپنی میں نائب مینجر تھا اور بڑا بھولا بھالا ہنس مکھ اور سیدھا سادا انگریز تھا۔ گھر میں وہ نیکر پہن کر گھومتا رہتا اور لان میں بیٹھ کر سیلون کی دیسی شراب پرایرق کے جام پر جام لنڈھایا کرتا۔ مسز جونس بھی پینے میں اُس سے پیچھے نہیں تھی۔ لیکن بڑی کنجوس عورت تھی۔ ننگے پاؤں صرف ایک چولا غالباً گاؤن پہن کر بنگلے کے کمروں اور برآمدوں میں چکر لگایا کرتی اور اپنے لڑکوں ایلن اور ڈیوڈ کو پکارتی رہتی۔

یہ دونوں لڑکے ایک ہی آفت کی پڑیا تھے۔ ان کا کام سکول سے واپس آ کر غلیل ہاتھ میں لے کر سارا دن سامنے والی کوٹھیوں کے عقبی ذخیرے میں بلبلوں کا شکار کرنا، بندر کی طرح تاڑ کے درخت پر چڑھ کر ناریل توڑ توڑ کر نیچے گرانا اور دوسروں کی کوٹھیوں میں اُگے ہوئے پپیتے کے درختوں پر سے پپیتے چرانا تھا۔ مسز جونس سگریٹ گھٹیا پیتی۔ شراب اس کا ایک رشتے دار جو کانا تھا اور جس کا سخت چہرہ بحری ڈاکوؤں سے ملتا جلتا تھا۔ ہر روز شام کو لے آتا تھا۔ شراب پی کر مسز جونس بڑی خیر اور دریا دل عورت بن جاتی۔ اس کا دل گداز ہو جاتا وہ بات بات پر آنسو بہانے لگتی اور اپنی جیب سے سگریٹ نکال نکال کر دوسروں کو پیش کرتی۔ اُس وقت اس کا منہ پسینے میں تربتر ہوتا۔ بائیں گال کا مسا کاسنی رنگت اختیار کر کے کانپ رہا ہوتا۔ چوڑے ہونٹ پھڑک رہے ہوتے اور مخمور آنکھوں میں محبت اور مامتا کے جذبات ٹھاٹھیں مار رہے ہوتے۔ وہ اپنے دونوں لڑکوں کو پاس بلا کر انہیں بڑا پیار کرتی اور جیب سے ساری نقدی نکال کر ان میں تقسیم کر دیتی۔ یہ الگ بات تھی کہ صبح کو جب اُسے ہوش آتا تو دونوں لڑکوں کو اپنے سامنے کھڑے کروا کر ان سے ایک ایک پائی رکھوا لیتی۔ مسز جونس کی والدہ ہالینڈ سے ہجرت کر کے کولمبو آئی تھی۔ مسز جونس کولمبو میں پیدا ہوئی تھی۔ وہ انگریزی اور سنہالی بڑی روانی سے بول لیتی تھی۔ مسز جونس کی والدہ نے بوریلا جنکشن میں بہت سی زمین خرید کر چھ سات کوٹھیاں بنوا لی تھیں۔ مسز جونس اپنی ماں کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ماں کی وفات کے بعد ساری جائیداد اُس کے پاس آ گئی۔ اب وہ بوریلا جنکشن کی سات کوٹھیوں کی واحد مالک تھی۔ سامنے والی کوٹھی میں اس کے رشہ دار رہتے تھے اور باقی کوٹھیاں کرائے پر دے رکھی ہیں۔ مسز جونس مالدار عورت تھی۔ لیکن اس کا لباس ہمیشہ بد وضع اور بے ہنگم ہوتا۔ میں نے اُسے ایک گاؤن کے علاوہ اور کسی لباس میں نہیں دیکھا۔ اس نے تین چار گاؤن بنا رکھے تھے۔ جنہیں وہ بدل بدل کر سارا سال پہنا کرتی۔ کوٹھی میں وہ ہمیشہ پاؤں سے ننگی رہتی صرف بازار جاتے ہوئے ایک چپل پہن لیتی۔ اس کا جسم بھاری تھا۔ عمر چالیس سال کے قریب تھی، رنگ زردی مائل سانولا تھا اور بالوں کا گردن پر جوڑا سا بنا کر رکھتی تھی۔ اس کے برعکس مسٹر جونس چوڑا چکلا اونچا لمبا گورا چٹا آدمی تھا۔ عمر چالیس سے اوپر تھی لیکن چہرے پر بشاشت اور رونق رہا کرتی۔ شراب پی کر جب وہ بھرپور قہقہے لگاتا تو معلوم ہوتا کوئی خوش فکرا جہازی کپتان ادھر نکل آیا ہے۔

NOVELS UPDATE
Mujtaza A. Siddiqui
mujtaza.com4u@gmail.com

مسز جونس بھی بڑی ہنس مکھ تھی اور اس کا قہقہہ مجھے بہت پسند تھا۔ جب وہ شراب کے نشے میں یا ویسے کسی بات پر قہقہہ لگاتی تو اس کی عمر کم ہونے لگتی۔ اس کے قہقہے میں زندگی کی تازگی اور شادابی تھی۔ اگر آپ کی آنکھیں بند ہوں تو یہ کسی کنواری لڑکی کا قہقہہ معلوم ہوتا تھا۔ اس قہقہے کے ساتھ گھنٹیاں سی بج اٹھتیں۔ شروع شروع میں تو مجھے ڈر ہوا کہ کہیں میں اس ادھیڑ عمر کی عورت سے ہی عشق نہ کر بیٹھوں۔ لیکن مسز جونس کی کنجوسی گال کے مکروہ مسّے اور دن بھر پاگلوں کی طرح ننگے پاؤں کوٹھی میں چکر لگاتے رہنے کی عادت کو دیکھ کر میرا سارا عشق فوراً فوچکر ہو جاتا۔ مسز جونس مجھ سے بڑی محبت سے پیش آتی تھی۔ خاص طور پر جب اسے معلوم ہوتا کہ مجھے فوجی راشن کارڈ پر نانی یعنی فوجی کنٹین سے شراب، بیئر سگریٹ، چائے، چینی، جام پنیر، ٹین فروٹ، شہد، کپڑا، اور ضروریاتِ زندگی کی دوسری چیزیں وافر تعداد میں اور انتہائی سستے داموں مل جاتی ہیں، تو اُس نے اپنے لطف و کرم کی مجھ پر عنایت کر دی۔ وہ صبح کا ناشتہ مجھے زبردستی اپنے ساتھ ہال کمرے میں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر کھلاتی اور رات کا کھانا بھی جب کبھی میں گھر پر ہوتا باہر نہ کھانے دیتی۔ وہ خندہ پیشانی سے میرا خیر مقدم کیا کرتی اور نوکروں سے اپنی نگرانی میں میرا کمرہ صاف کروایا کرتی۔ میں صرف اتنا کرتا کہ ہر پندرہ روز کے بعد جب سٹیشن ویگن میں نانی سے سامان لاتا تو اُسے شراب کی ایک بوتل، چینی، ٹن فروٹ، سگریٹ اور چاکلیٹ کے دو چار ڈبے مفت دے دیا کرتا۔ حقیقت میں میرا ان پر بہت تھوڑا خرچ ہوتا تھا۔ آپ ان اشیاء کی قیمت کا یہاں سے اندازہ لگا لیجئے کہ نانی سے مجھے سکاچ وسکی کی بوتل جو میں مسز جونس کے لئے لاتا تھا۔ سات روپے میں ملتی تھی۔ جبکہ مارکیٹ میں اس کا بھاؤ ساٹھ روپے بوتل تھا۔ گولڈ فلیک کا ڈبہ بازار میں تین روپے دس آنے میں ملتا تھا اور مجھے نانی میں صرف سوا دو روپے میں مل جاتا تھا۔ پھر اس کے علاوہ ---- چرچ مین، سینٹر سروس اور کریون اے کے ٹن بھی انتہائی سستے داموں مل جاتے تھے۔ ایک بار میرے ہاتھ میں سینٹر سروس کی بیس سگریٹوں والی چوڑی ڈبی دیکھ کر مسز جونس نے خوشی سے چیخ کر کہا۔

"اوائی گاڈ: یہ تو میرا پسندیدہ ترین سگریٹ ہے۔ مسٹر وصال! پلیز اس کا ایک پیکٹ مجھے بھی لا دیں۔ میں پیسے دوں؟"

"پیسوں کی کیا ضرورت ہے مادام۔"

میں نے دوسرے روز اُسے سینٹر سروس کی چار ڈبیاں مفت لا کر دے دیں۔ مسز جونس تو میری گرویدہ ہو گئی تھی۔ مسٹر جونس بھی میری بڑی عزت کرتا تھا اور میرے آرام کا ہر طرح سے خیال رکھتا تھا۔ یہ لوگ اور ان کے سامنے والی کوٹھی کے رشتہ دار مجھے روپے دیتے اور میں اپنے کارڈ پر ان کے لئے نانی سے انتہائی سستے داموں کپڑا، شراب اور چینی لے آیا کرتا۔ ان باتوں نے ان لوگوں کو میرا ممنون احسان کر رکھا تھا اور وہ اپنی ہر دعوت اور پارٹی میں مجھے ضرور شریک کرتے تھے۔

مسز جونس کے سامنے والی کوٹھی کے رشتہ داروں کا ٹولہ کچھ شرارتی بگڑے دل بچوں، بیزار صورت ایک بوڑھے جوڑے اور ایک جوان لڑکی پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ شام کو اولمس پیلس کے لان میں آ کر نشست جما لیتے۔ بوڑھا جوڑا چہل قدمی ٹیکتا ایک دوسرے کے سہارے چلتا آیا کرتا۔ بڈھے میاں بیوی یوں پھونک پھونک کر زمین پر قدم رکھتے گویا تنی ہوئی رسی پر چل رہے ہوں۔ جوان لڑکی کا نام مس ایلس تھا۔ پتلا دبلا جسم، لمبا ناک، بھینگی آنکھیں، بطخ جیسی چال، آواز میں کرختگی ---- اگر یہ لڑکی جوان نہ ہوتی تو شاید دنیا کا کوئی شخص اُسے اپنے پاس بیٹھنے کی اجازت نہ دیتا۔ وہ کانا شراب کا رسیا اس لڑکی سے عشق کرتا تھا۔ اس کانے کا نام مچل تھا۔ مگر میں اُسے کانا ہی کہوں گا۔ کیونکہ اس لقب میں اس شخص کی پوری شخصیت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کا چہرہ کرخت اور جانوے سے مشابہت رکھتا تھا۔ وہ کانا اس طرح تھا کہ اس کی ایک آنکھ درمیان سے شق ہو گئی تھی۔ جیسے کسی نے چاقو مار کر ڈیلے کے دو ٹکڑے کر دیئے ہوں۔ معلوم ہوا کہ وہ بچپن میں ایک درخت سے گر پڑا تھا اور آنکھ میں پتھر کی نوک چبھ گئی تھی۔ وہ مضبوط ڈیل ڈول کا آدمی تھا۔ اور سیلون ٹی کمپنی میں ہی مسٹر جوزف کے ماتحت کام کرتا تھا۔ رہتا وہ کہیں بھلوٹی کی طرف تھا لیکن ہر روز شام کو اپنی بطخ نما محبوبہ مس ایلس کی زیارت کو بوریلا جنکشن ضرور آتا۔

کانا عاشق اپنی محبوبہ کا ہاتھ تھام کر دبے پاؤں گوریلا ایسی احتیاط کے ساتھ اندر داخل ہوتا اور میز کے گرد بیٹھ کر کانی آنکھ کو بار بار جھپکاتا۔ دوسری آنکھ سے ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیتا۔ شراب وہ چوہے کی طرح بغیر آواز اور کسی قسم کی آہٹ کے پی جاتا۔ اُسے بالکل نشہ نہیں ہوتا تھا۔ یعنی یوں کہہ لیجئے کہ وہ کبھی مسٹر جونس کی طرح پی کر شور نہیں مچاتا تھا اور نہ ہی مسز جونس کی طرح شراب کے نشے میں بچوں میں پیسے تقسیم کرتا تھا۔ اور نہ بات بات پر رونا شروع کر دیتا تھا۔ صرف نصف بوتل چڑھانے کے بعد اتنا ہوتا کہ اس کا چہرہ

Murtaza A. Siddiqui
murtaza4u@gmail.com
NOVELS
URDU

سوج کر کپا ہو جاتا۔ سر گردن پر دائیں بائیں ہلنا شروع کر دیتا اور کانی آنکھ سے پانی بہنے لگتا۔ وہ بار بار رومال سے اپنی کانی آنکھ پونچھے چلے جاتا۔ ایک بار جونس نے اس کے دائیں بائیں طوطے کی طرح گردش کرتے سر کو ہاتھ سے پکڑ لیا۔

"تم شراب پی رہے ہو یا گرجا میں نماز پڑھ رہے ہو۔ سر کو قابو میں رکھو، نہیں تو ابھی اسے اتار کر تمہاری ہتھیلی پر رکھ دوں گا۔"

اس پر مسز قہقہہ مار کر ہنس پڑی اور اُس نے میرے ڈبے میں سے سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔ میں نے مسز جونس کا پہلا آدھا قہقہہ آنکھیں کھول کر اور دوسرا آدھا آنکھیں بند کر کے سنا۔ بس اس عورت پر صرف آنکھیں بند کر کے ہی عاشق ہوا جا سکتا تھا۔ اگر یہ کہیں مجھے جوانی میں ملتی تو میں نے اس کے قہقہے لگوا لگوا کر اسے کب کا پاگل خانے پہنچوا دیا ہوتا۔

کانا اپنی بطخ جیسی محبوبہ کا شیدائی اور دیوانہ تھا۔ اصیل مرغ کی طرح سینہ پھلا کر پر جھاڑ کر اس کے گرد چکر لگایا کرتا۔ وہ بھینگی خاتون بھی اپنے کانے رومیو کی دیوانی تھی وہ ایک آنکھ سے محبت بھری نظر اُس پر ڈالتا تو وہ پے در پے ٹھنڈے ٹھنڈے سانس بھرنا شروع کر دیتی اور ٹھنڈی یخ ہو جاتی۔ ایک روز میں دفتر سے ذرا جلدی آ گیا۔ برآمدے میں سے گزرنے لگا تو بڑے ہال کمرے کا دروازے کھلا تھا۔ یونہی اندر نظر پڑ گئی، کیا دیکھتا ہوں کہ کانے صاحب صوفے کے بازو پر بیٹھے ہیں۔ صوفے پر ان کی بھینگی محبوبہ بیٹھی ہے۔ کانے صاحب نے بازو اس کی گردن میں حمائل کر رکھے ہیں اور ہونٹوں سے ہونٹ پیوست ہیں۔ یعنی آپ محبت کے انتہائی روحانی دور میں تھے اور اپنی محبوبہ کا منہ چوم رہے تھے۔ چوم کیا رہے تھے کب کے چوم چکے تھے اور اب یونہی بطخ کے ہونٹوں پر رکھے ہوئے تھے۔ بطخ کی بھینگی آنکھیں شدت خمار سے، فرط جذبات سے اور یا زیادتی کمزوری کی وجہ سے بند تھیں اور چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ چونکہ کانے عاشق کی کانی آنکھ میری جانب تھی، اس لئے وہ مجھے بالکل نہیں دیکھ رہا تھا۔ ویسے بھی میں ان بے چاروں کے رومان میں مخل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ مجھے اس وقت وہ دونوں ایک ایسا یتیم جوڑا معلوم ہو رہا تھا جن کا دنیا میں کوئی باقی نہ ہو۔ میں اس یتیم رومان کو عبرت کی نگاہ سے دیکھتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔

ہماری کوٹھی کے لان کی دیوار ڈیڑھ مرد اونچی تھی اور بارش کی مار کھا کھا کر سیاہ پڑ گئی تھی۔ داہنی جانب پپیتے کا ایک درخت تھا۔ دیوار کے ساتھ ساتھ ناریل کے درخت اُگے

ہوئے تھے۔ عقبی دیوار پر کیلے کے چوڑے چوڑے پتوں کا سایہ تھا۔ وہاں مرغیوں کا بڑا سا ڈربہ تھا۔ جس میں مسز جونس کی نصف درجن مرغیاں رات کو استراحت فرمایا کرتی تھیں۔ ایک بار ایک مرغی کڑکڑاتی تو مسز جونس کی کوٹھی میں رہی لیکن انڈہ دوسری کوٹھی والوں کے گیراج میں دے آئی۔ مسز جونس نے جب دیکھا کہ مرغی تو چپ ہے مگر انڈہ کہیں نہیں، تو اُس نے سارا گھر سر پر اٹھا لیا اور ڈیوڈ ایلن دونوں کو انڈے کی سراغ رسانی کو دوڑا دیا۔ ان دونوں شرارتی لونڈوں کو خدا ایسا موقع دے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ لوگوں کی کوٹھیوں کے لان ڈھونڈ مارے بلکہ مرغی کے انڈے کی تلاش میں ناریل کے پیڑوں پر بھی چڑھ گئے۔ آخر انہوں نے ساتھ والی کوٹھی کے گیراج میں سے اپنی مرغی کا انڈا تلاش کر لیا۔ مسز جونس نے انڈا ہاتھ میں پکڑ لیا اور اُسے یوں گھما پھرا کر دیکھنے لگی جیسے وہ کوہ نور کا ہیرا ہو۔ اُس نے مرغی کے خوب جوتے لگائے اور انڈا مرتبان میں جمع کر دیا۔

بوریلا جنکشن کی ان کوٹھیوں کے درمیان والی سڑک چھوٹی سی تھی۔ جس پر سرخ بجری بچھی ہوئی تھی۔ یہ گلی یا سڑک آگے جا کر ختم ہو جاتی تھی۔ یہاں سے دن میں کئی بار پھیرے والے گذرا کرتے۔ وہ عجیب عجیب آوازیں لگا کر عجیب عجیب چیزیں بیچا کرتے۔ مثلاً مچھلی کا بدبودار اچار منگوستین ایک قسم کا پھل جس پر کانٹے نکلے ہوتے وغیرہ وغیرہ----

چوک میں گوتم بدھ کا ایک مندر تھا۔ مندر چھوٹا سا تھا اور گول تھا۔ چاروں طرف سے بند تھا۔ صرف ایک طرف دروازہ تھا۔ دیواروں پر جالیاں لگی تھیں۔ ان جالیوں میں اندر جلنے والا لوبان اور اگر بتیوں کی خوشبو باہر آیا کرتی تھی۔ جب صبح کو میں اس مندر کے قریب سے گزرتا تو مجھے تیز خوشبوؤں کے ساتھ اندر سے سنہالی زبان میں بھجن گانے کی آوازیں سنائی دیا کرتیں۔ چوک کی دوسری طرف ایک مارکیٹ تھی۔ جس میں ضرورت کی ہر چیز مل جاتی تھی۔ کولمبو شہر کے ہر چوک میں اس قسم کی ایک مارکیٹ ضرور تھی۔ یہ مارکیٹیں عام طور پر صبح سے لے کر رات گئے تک کھلی رہتی تھیں اور یہاں سے سوئی کے تاگے سے لے کر چارپائی کے بان تک ہر شے دستیاب ہو جاتی تھی۔ مارکیٹ کے ساتھ میوہ منڈی تھی۔ جہاں آم، اناس، ناریل اور کیلوں کے ڈھیر پڑے رہتے۔ اس منڈی سے میرا نوکر نگم چار سینٹ کا ایک موٹا تازہ اناس لے کر آ جاتا۔ اس نے اناس کو شاخوں سے پکڑ رکھا ہوتا۔ یوں لگتا جیسے کوئی جلاد گردن کاٹ کر اُسے بالوں سے پکڑ کر لا رہا ہو۔ پھر وہ اناس کو پلیٹ میں رکھ کر

NOVELS UPDATES
M. Murtaza A. Siddiqui
murtaza4u@gmail.com

بڑی چھری سے بڑی چابکدستی سے چاروں طرف گھما پھرا کر چھیلنا شروع کر دیتا۔ اناناس کو کاٹنا بڑا فن ہے اور یہ فن صرف کولمبو والے ہی جانتے ہیں۔ جس طرح پنجاب والے گنا چھیلنے اور کاٹنے کے فن میں ماہر ہیں۔ بوریلا جنکشن کے چوک میں چار کی بجائے پانچ سڑکیں پھٹتی تھیں۔ ایک سڑک گال روڈ کی طرف نکل گئی تھی۔ دوسری ریڈیو سیلون یعنی میونسپل ہال کی طرف جاتی تھی۔ تیسری کولمبو سے آگے دوسرے مضافاتی شہروں کی طرف چلی گئی تھی چوتھی سمندر کی طرف اور پانچویں شہر کے وسط کی طرف جاتی تھی۔ یہاں سے ٹرام صرف تین سڑکوں پر چلتی تھی۔ باقی دونوں سڑکوں پر ٹرام کی بجائے بجلی کی ایک منزل اور دو منزل بسیں چلا کرتی تھیں۔

ریڈیو سیلون کی عمارت دو منزلہ تھی اور اس کے اندر بیچ والے لان میں شہریفے کا ایک درخت آگا ہوا تھا۔ ریڈیو سی ایک سیلون امریکی اور ہندوستانی محکموں میں منقسم تھا۔ ہندی سیکشن کے انچارج میجر حامد تھے اور امریکی سیکشن کے کرنل رائٹ انچارج تھے۔ ویسے تو امریکی اناؤنسر کئی ایک تھے۔ لیکن مس کیٹی کا جواب نہیں تھا۔ یہ بھرپور جوان امریکی عورت دو خاوند مار چکی تھی۔ اب اُس سے ہر کوئی شادی کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ دوست اُس کے سبھی تھے۔ لیکن خاوند کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کے بال سنہری تھے، چہرہ گول اور سرخ و سپید تھا، آنکھیں نیلی تھیں اور ان میں بحیرہ روم کی نیلگوں گہرائیاں چھپی ہوئی تھیں۔ ہماری مدراسی اناؤنسر مس لکشمی کو دیکھ کر بھوت پریت کا خیال آجاتا تھا۔ وہ سوکھی ساکھی چمرخ سی تھی، رنگ سیاہ، آنکھیں نسواری اور قد لمبا تھا۔ لگڑ بگڑ کی طرح چلتی اور بالوں میں پھول لگانے کبھی نہ بھولتی۔ اس کی آواز بڑی اچھی تھی۔ اس آواز نے کئی مدراسی نوجوانوں کے خرمنِ عقل و ہوش میں آگ لگائی تھی۔ وہ جذبہ عشق میں سرشار ہو کر کشاں کشاں ریڈیو سیلون کی طرف آتے اور مس لکشمی کے درشن کرنے کے بعد روتے پیٹتے بال نوچتے واپس ہوتے۔

میجر حامد کی سیکرٹری نے ہمارے سیکشن کے سبھی جوانوں کو مسحور کر رکھا تھا۔ حوالدار موہن سنگھ، صوبیدار بوستاں خان اور حوالدار پرکاش سبھی اُس سے درپردہ عشق کر رہے تھے اور اس سے ہنس کر بات کرتے تھے۔ اس کا نام مس روتھ تھا۔ وہ اینگلو سیلونی عورت تھی۔ جسم گداز اور سینہ بری طرح ابھرا ہوا تھا۔ اس اُبھرے ہوئے سینے نے کئی دل

والوں کو ڈبو کر رکھ دیا تھا۔ سینے کی دو چوٹیاں ہر کوہ پیما کو اپنی طرف بلایا کرتیں۔ حسب عادت میں نے جاتے ہی مس روتھ اور مس کیٹی دونوں سے عشق شروع کر دیا۔ اور تو اور میں نے مس لکشمی کو بھی مایوس نہیں ہونے دیا۔ ایک روز وہ ریکارڈوں کا سپیڈ ٹسٹر لینے میرے سٹوڈیو میں آ گئی۔ پروگرام شروع نہیں ہوا تھا۔ میں کچھ پنجابی گانوں کی ڈسکیں دیکھ رہا تھا۔ اُس نے بڑی نرم آواز میں ہندوستانی میں مجھ سے سپیڈ ٹسٹر مانگا۔

میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بھی مسکرا دی۔ میں نے ہیڈ فون اتار کر کہا۔

"مس لکشمی ایک بات کہوں؟"

"کہو۔"

"برا تو نہیں مانو گی۔؟"

"جی نہیں۔"

"جب تم مسکراتی ہو تو مجھے مدراس کے جنگلوں میں کھلے ہوئے کنول کے پھول یاد آ جاتے ہیں۔"

لکشمی شرما گئی اور پہلے سے زیادہ بدصورت معلوم ہونے لگی۔ میں نے سپیڈ ٹسٹر اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے اس کا ہاتھ ذرا سا دبا دیا۔ اس نے شرما کر منہ دوسری طرف کر لیا اور ساڑھی کا پلو دانتوں تلے دبا کر باہر نکل گئی۔ دوسری بار جب ہمیں تنہائی کا موقع ملا تو میں نے اُسے صاف صاف کہہ دیا۔

"مس لکشمی مجھے تم سے پریم ہو گیا ہے۔"

"اوئی پریم؟"

"ہاں لکشمی پریم! جسے کچھ لوگ ہمارے ہاں پریم چند اور پریم ناتھ بھی کہتے ہیں۔"

لکشمی شرم سے پانی پانی ہو گئی اور مجھے اپنے آپ پر بے حد غصہ آیا کہ کمبخت یہ کیا کر رہا ہوں۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے کیکڑے کو ہتھیلی پر اٹھا لیا ہو۔ لکشمی لاج کی ماری دُہری ہو گئی۔ میں نے کیڑا ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ بہرحال لکشمی کو یقین ہو گیا کہ میں اُس پر جان دیتا ہوں۔ وہ اب بڑی بن سنور کر دفتر آتی اور ہر روز ایک نئی ساڑھی بدلتی۔ میری طرف بڑے نخرے سے دیکھتی اور بات بات پر شرمانے کی کوشش کرتی۔ ادھر میجر صاحب کی سیکرٹری مس روتھ کی طرف بھی میں نے پیش قدمی شروع کر دی۔ وہاں ذرا

Murtaza A. Siddiqui
mascom4u@gmail.com
NOVELS
URDU

معاملہ مشکل تھا۔ کیونکہ دفتر کے عملے کے علاوہ امریکی محکمے کے دفتر کا سارا عملہ بھی اُس پر ڈورے ڈال رہا تھا۔ بلکہ کئی ایک تو ڈورے ڈال کر روتھ کو جکڑ بھی چکے تھے۔ روتھ بڑی فیاض قسم کی عورت تھی۔ ہر ایک کا جی خوش کر دیا کرتی۔ ہر ایک کی بات کا جواب ہنس کر دیتی اور سانس پھلا کر سینے کا ابھار مزید اونچا کر دیتی۔

ہمارے میجر حامد کے ساتھ وہ گال مینس ہوٹل میں کھانا کھانے چلی جایا کرتی تھی۔ ہمارے میجر صاحب بھی روتھ سے عشق کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ انہوں نے تو امریکی اناؤنسر مس کیٹی کو بھی اپنے دامِ تزویر میں پھنسا رکھا تھا۔ میں نے ایک بار ان دونوں کو کولمبو کے ایک ہوٹل میں ڈانس کرتے اور دو بار سٹوڈیو نمبر 7 میں ایک دوسرے کا منہ چومتے دیکھا تھا۔

جو میں اچانک میجر حامد کے کمرے میں داخل ہوا تو آپ نے اپنی سیکرٹری مس روتھ کو زانوؤں پر بٹھا رکھا تھا۔ اور اُس کے سینے کی چوٹیوں پر اپنا ناک رگڑ رہے تھے۔ میں الٹے پاؤں واپس ہو گیا۔ میرے تن بدن میں انگارے دہکنے لگے تھے۔ اُس دن کے بعد میں نے روتھ کی طرف باقاعدہ پیش قدمی شروع کر دی۔ اُسے وائن اور پھولوں کا تحفہ پیش کر دیا جو اُس نے مسکرا کر قبول کر لیا۔ دو روز بعد میں نے اُسے اپنے گھر کھانے پر بلا لیا۔ ہفتے کی شام تھی۔ میں نے مسز جونس اور مسٹر جونس کو بھی دعوت میں شریک کر لیا تھا۔ انہوں نے خالص انگریزی کھانے تیار کئے تھے۔ مسز جونس تو ایک ماہر خانساماں کی طرح ہر کیتلی کا ڈھکنا اٹھا اٹھا کر سالن چکھتی اور سر ہلا کر اپنے بہترین باورچی ہونے کا خود ہی اعتراف کرتی جاتی۔ مس روتھ بڑا بھڑکیلا لباس پہن کر شام ہی کو آ گئی۔ رات کے نو بجے تک شراب کا دور چلتا رہا۔ جونس اور مسز جونس نے خوب پی لی۔ کہیں سے ان کا کانا کزن بھی آ گیا۔ کم بخت کو بہترین کھانوں اور شراب کی بو دو کوس سے وہاں کھینچ کر لے آئی۔ اعلیٰ قسم کی شرابیں اور کھانے میز پر چنے دیکھے تو اُس کی کانی آنکھ پھڑکنے لگی۔ وہ ہاتھ ملتا ہوا میز پر بیٹھ گیا اور دیکھتے دیکھتے شراب کا پورا گلاس ہضم کر گیا۔

تعارف کروانے کے بعد بھی وہ گھنا بن کر بیٹھا رہا اور ہاتھ ملتا اور کانی آنکھ کو پھڑکا پھڑکا کر شراب کے گلاس پر گلاس چڑھاتا رہا۔ سات پیگ پینے کے بعد اُس نے اپنی گردن طوطے کی طرح ہلانی شروع کر دی۔ کھانے پر اُس نے وہ ہاتھ دکھائے کہ میں دنگ رہ گیا۔

روتھ نے بھی کچھ زیادہ پی لی تھی۔ اور وہ مسز جونس اور مسٹر جونس سے فرفر باتیں کئے جا رہی تھیں۔ انہیں اپنے معاشقے اور پہلے خاوند کی احمقانہ باتیں سنا رہی تھی۔ کبھی میری طرف دیکھ کر مسکرا دیتی اور میرا ہاتھ پکڑ کر کہتی۔

"وصی! تم سگریٹ ہو۔ تم ابھی بچے ہو۔ زندگی نے تمہیں کچھ نہیں بتایا۔ ابھی تمہیں بہت کچھ سیکھنا ہے۔ کیا تم نے کبھی عشق کیا ہے۔"

میں نے دیکھا مسز جونس اور مسٹر جونس میری طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ کانا کزن شراب کے نشے میں دھت تھا اور اپنے خیال میں مگن گردن کو دائیں بائیں ہلاتے ہوئے ہاتھ مل رہا تھا۔ میں نے سگریٹ سلگا کر روتھ کی آنکھوں میں آنکھوں ڈال کر کہا۔

"مجھے تو تم سے عشق ہو گیا ہے۔"

میں نے شراب کے نشے کا جائز فائدہ اٹھایا تھا۔ روتھ قہقہ لگا کر ہنس پڑی۔ سب ہنسنے لگے۔ مسز جونس نے بھی قہقہ لگایا۔ گھنٹیاں ہی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ روتھ نے سینہ پھلا کر کہا۔

"اوائی ڈیر بوائے۔ آئی ٹو لو یو۔؟

اور اس کے ساتھ ہی اُس نے سب کے سامنے میرا بوسہ لے لیا۔ اس کے شراب آلود ہونٹوں کا دباؤ محسوس کر کے میں بیدار سا ہو گیا اور میرا آدھا نشہ ہرن ہو گیا اور آنکھیں جلنے لگیں۔ میرا جی چاہا کہ روتھ کو توڑ مروڑ کر چکنا چور کر دوں اور اٹھا کر سمندر میں پھینک دوں۔ روتھ کے بوسہ لینے پر سب نے تالیاں بجا کر ہماری محبت کا اعلان کر دیا۔

رات گئے تک یہ خوبصورت محفل جاری رہی۔ میں روتھ کو چھوڑنے اُس کے گھر تک گیا۔ ہم دونوں سٹیشن ویگن کی پچھلی نشستوں پر بیٹھے تھے۔ روتھ کے گرم جسم میں سے شراب کا سینک اُٹھ رہا تھا۔ اس کی نیم گرم سلگتی ہوئی شرابی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس کے سینے کا اُبھار طوفانی لہر کی طرح کبھی اوپر اٹھ رہا تھا اور کبھی نیچے گر رہا تھا۔ میری آنکھیں جل رہی تھیں۔ اور جسم کا بند بند ٹوٹ رہا تھا۔ روتھ نے اپنی بانہیں میرے گلے میں حمائل کر دیں۔ میں نے اسے اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے ریشم کے سرہانے کو اپنے ساتھ لگا لیا ہو۔ ہم گال روڈ پر جا رہے تھے۔ ہمیں بائیں جانب شوریدہ سر سمندر کی لہروں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ہمارے ہونٹ ایک دوسرے کے ہونٹوں میں

NOVELS URDU Stories
Murtaza A. Siddiqui
murtazam4u@gmail.com

پیوست تھے اور جسم ایک دوسرے کے جسم سے لپٹا ہوا تھا۔ اچانک سٹیشن ویگن ایک کوٹھی میں داخل ہو کر رک گئی۔ ہم ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ میں نے روتھ کو ہاتھ سے پکڑ کر باہر نکالا۔ میں اسے ساتھ لے کر کوٹھی کے بغلی دروازے کی طرف آ گیا۔ وہ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہونے لگی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ وہ مجھے رات وہیں بسر کرنے کی دعوت دے دے۔ شاید اس نے میری اس خواہش کو میری آنکھوں میں دیکھ لیا تھا۔ وہ مجھ سے بغلگیر ہو گئی اور میرا منہ چوم کر بولی:

"شب بخیر وصی! پھر کسی روز سہی، اس روز میں تمہاری دعوت کروں گی۔ شب بخیر۔"

اس کے ساتھ ہی اپنے کمرے میں داخل ہو کر کمینی عورت نے دروازہ بند کر دیا اور میں وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ سٹیشن ویگن میں بیٹھ کر واپس اولمپس پیلس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مسز جونس برآمدے کے فرش پر بیٹھی ہے۔ اپنے بچوں کو نیند سے اٹھا کر پاس بٹھلا رکھا ہے۔ اور انہیں زبردستی سینڈ اور دوسرے سکے دے رہی ہے۔ انہیں پیار کر رہی ہے اور رو رہی ہے۔ مسٹر جونس باغ والی آرام کرسی پر پڑے پڑے سو گئے ہیں اور خراٹے لے رہے ہیں۔ کانا کزن وہاں شراب کی بچی ہوئی بوتل بغل میں دبا کر نو دو گیارہ ہو چکا ہے۔ مسز جونس نے مجھے آتا دیکھا تو مسکرا کر بولی:

"وصی! یہ میرے بچے ہیں۔ میں ان سے محبت کرتی ہوں۔ میری یہی جائداد ہے۔ میری سات کوٹھیاں ہیں۔ لیکن مجھے ان کی کوئی پرواہ نہیں۔ ان میں سے کوئی میرے ڈیوڈ اور ایلن کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔"

اور پھر ایلن کو پکار کر کہنے لگی۔

"یہ لو ایلن! ایک چونی اور لے لو بس ایک چونی اور لے لو۔"

میں جانتا تھا کہ وہ صبح کو ساری چونیاں اُس سے رکھوا لے گی۔ بچے بھی اس انجام سے پوری طرح واقف تھے۔ اسی لئے وہ کسی قسم کی خوشی کا اظہار کئے بغیر چونیاں اپنی جیبوں میں ڈالے جا رہے تھے۔ جیسے کسی کی امانت سنبھال کر رکھ رہے ہوں۔

مسز جونس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا:

"مسٹر وصی! میں تمہاری بڑی شکر گذار ہوں کہ تم بڑے اچھے ہوں۔ مجھے تم ایسا ہمسایہ کبھی نہیں ملے گا۔ تم نے آج دعوت پر بڑا روپیہ خرچ کر دیا۔ مس روتھ بڑی سویٹ عورت

ہے۔ کیا تم بھی اس سے محبت کرتے ہوں؟ ویری فائن اچھا مسٹر وصی! تمہارے پاس سگریٹ ہوں گے؟"

میں نے اپنے کمرے میں جا کر الماری میں سے سینئر سروس کی پوری ڈبیا لا کر مسز جونس کو دے دی۔ اس عورت نے ڈبیا لے کر میرا شکریہ ادا کیا اور ہاتھ چوم لیا اور پھر اپنے بچوں سے باتیں شروع کر دیں۔ میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ کپڑے اتار کر صوفے پر پھینکے۔ پانی کا پورا ایک جگ پیا۔ بتی گل کی اور پلنگ پر گرتے ہی سو گیا۔

میرا شروع ہی سے یہ عقیدہ رہا ہے کہ صبح کی سیر انسان کی صحت کے لئے بڑی مفید ہے۔ میں امرتسر میں صبح کی سیر ضرور کیا کرتا تھا۔ کولمبو میں آ کر میں نے سوچا یہاں بھی سیر کا مشغلہ جاری رکھنا چاہیئے۔ ایک روز میں منہ اندھیرے اٹھا اور بوریلا چوک میں آ کر اس سڑک پر چل نکلا جو کولمبو کے مضافات کو چلی گئی تھی۔ امرتسر میں کھیتوں کی کھلی فضاؤں میں سیر کرنے کا عادی تھا۔ لیکن یہاں کوٹھیوں کا سلسلہ ختم ہونے میں ہی نہ آتا تھا۔ اس پر ستم یہ کہ ان کوٹھیوں میں کئی جگہ باورچی خانوں میں چولہے روشن تھے۔ اور مٹی کے تیل کی بو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں دود کش سے دھواں بھی اٹھ رہا تھا۔

علاوہ ازیں پھولوں اور سبزے کے مہک کی بجائے باسی مچھلی کی بو ہوا میں رچی ہوئی تھی۔ میں تھوڑی ہی دور جا کر واپس آ گیا۔ اس کے بعد میں نے صبح کی سیر کا کبھی نام نہ لیا۔ دراصل صبح ہمیشہ جگل کی اور شام ہمیشہ شہر کی خوبصورت ہوتی ہے۔ شام کو چاروں طرف روشنیوں کا سیلاب اُمڈ آتا اور کولمبو کی سڑکیں دلہن کی طرح آراستہ ہو جاتیں۔ اگر بارش ہو رہی ہوتی تو شام کا حسن دوبالا ہو جاتا۔ کولمبو میں بارشیں بڑی زوردار اور موسلادھار ہوتی تھیں۔ ابھی دھوپ نکلی ہوئی ہے اور ابھی بادل چھا گئے ہیں اور چھاجوں پانی برسنے لگا ہے۔

بدھی بھکشو اور بھکشنیں زرد دھوتیاں پہنے کیلے کے چوڑے پتوں کی چھتری سر پر پھیلائے فٹ پاتھ پر سے گذرا کرتے۔ کہیں کوئی عورت پان کی ٹوکری اٹھائے چلی جا رہی ہے۔ کہیں کوئی آدمی کیلے اور اناس سے بھرا ہوا ٹوکرا سر پر رکھے منڈی کی طرف بھاگا چلا جا رہا ہے۔ مضافات کو جانے والی بسیں پرانی طرز کی تھیں اور مسافروں سے ٹھنسی ہوئی ہوتی تھیں۔ انہیں شہر کی خوبصورت اور جدید سڑکوں پر سے گذرنے کی اجازت نہیں تھی۔ کیونکہ وہ جلے ہوئے تیل کے دھوئیں کے بادل اڑاتی جاتی تھیں۔ کولمبو شہر کی سب سے بڑی

Murtaza A. Siddiqui
mascom4u@gmail.com
NOVELS UPLOADED STORIES

اور مشہور ترین سڑک کا نام گال تھا۔ گال روڈ جیسا کہ کہا جاتا ہے کوئی پچاس میل لمبی تھی۔ کچھ دور تک وہ شہر کے ساتھ ساتھ جاتی تھی۔ جب شہر ساتھ چھوڑ دیتا تو وہ دوسرے شہروں کی طرف کھلتی چلی گئی تھی۔ یہ سڑک سمندر کے ساتھ ساتھ جاتی تھی۔ دونوں طرف عالی شان عمارتیں اور خوبصورت کوٹھیاں کھڑی تھیں۔ ناریل، تاڑ اور سرخ پھولوں والے ایک خاص قسم کے درختوں کی بھی بھرمار تھی۔ پچاس ساٹھ گز چوڑی سڑک تھی۔ اسی کے راستے میں کولمبو کا مشہور بیچ تھا اور ماؤنٹ لیونیا ہوٹل بھی تھا۔

ماؤنٹ لیونیا ہوٹل سمندر کے کنارے واقع تھا۔ داہنی جانب کھلا بیچ پھیلا ہوا تھا۔ سمندر کی لہریں بڑی دور دور سے آتی اور ساحل سمندر کے اوپر چڑھ کر دور تک پھیلتی چلی جاتیں۔ کنارے کنارے ناریل اور تاڑ کے درختوں کا جنگل سا اگا ہوا تھا۔ سمندر کی لہریں ان درختوں کے تنوں کا منہ دھلا کر واپس سمندر میں چلی جاتیں۔ یہاں شام کو عورتیں مرد اور بچے نہانے آیا کرتے۔ یورپی عورتوں کا ایک ہجوم ہوتا۔ انہوں نے نہانے کا لباس پہن رکھا ہوتا اور ڈوبتے سورج کی ارغوانی روشنی میں ان کے سپید سپید جسم چمک رہے ہوتے۔ سمندر کی لہریں جب ان کی ٹانگوں سے ٹکراتیں تو وہ اچھل کر ان لہروں پر سوار ہو جاتیں۔ اور ساحل کی طرف کھسکنا شروع کر دیتیں۔ پھر وہ تیرتی ہوئی سمندر میں آگے نکل جاتیں۔ یہاں میں نے ایک روز اپنے دفتر کی سیکرٹری مس روتھ کو نہاتے دیکھا۔ اس کے ساتھ امریکی سیکشن کا اناؤنسر پول بھی تھا۔ پول دبلا پتلا سا امریکی لڑکا تھا جو ریڈیو پر مختلف ملکوں کی دلچسپ رسومات کے بارے میں تقریریں بھی کیا کرتا تھا۔ ایک بار اس نے مجھ سے پوچھا:

"مسٹر وصی! یہ لفظ پنجاب ہے یا پُنجاب؟"

روتھ نے بیدنگ سوٹ پہن رکھا تھا۔ اور وہ بے حد عریاں تھی۔ میں لیونیا ہوٹل کے ٹیرس پر اپنے ایک دوست کے ساتھ بیٹھا کافی پی رہا تھا۔ روتھ کے سینے کا ابھار بڑا نمایا ہو رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے اپنے انگیا کے نیچے دو بڑے بڑے خربوزے چھپا رکھے ہیں۔ میں ان خربوزوں کو ہی دیکھتا رہا۔ نہانے سے فارغ ہو کر روتھ تولئے میں اپنا آپ لپیٹے جب ہمارے قریب سے گزری تو اس نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور ہاتھ ہلایا۔ میں کرسی پر بیٹھا بیٹھا ہل گیا۔ خربوزوں کی خوشبو نے مجھے مسحور کر دیا۔ میں نے بھی مسکرا کر اپنا ہاتھ ہلایا۔ میرے دوست نے جو پٹیہ کے کاروباری علاقے سے تعلق رکھتا تھا اور حیدر آباد دکن کا

تھا۔ ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا:

"بڑی زبردست عورت ہے یار کون ہے یہ؟"

میں نے اسے بتایا:

"کولمبو کی نائٹ کلب کی مشہور ڈانسر ہے۔ ایک ہفتہ ہوا امریکہ سے آئی ہے۔"

"تمہاری دوست ہے کیا؟"

"اور نہیں تو کیا یونہی ہاتھ ہلا رہی تھی۔؟"

میرے دوست کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا:

"تو پھر یار کسی روز نائٹ کلب میں چل کر اس کا ڈانس دیکھا جائے۔"

میں نے کہا:

"اس کا کیا فائدہ۔"

"ذرا تعارف ہو جائے گا۔"

میں نے کہا:

"بکواس بند کرو۔"

جانے کیوں میں نے اپنے دوست کو روتھ کے بارے میں غلط اطلاع دی۔ در اصل روتھ کا جسم اتنا بھرپور، بھرا بھرا، صحت مند اور پکے ہوئے پھل کی طرح تھا کہ مجھے بے اختیار رات کی کلبوں میں ابھرے ہوئے پیٹوں والی اور گداز جسموں والی ڈانسروں کا خیال آ گیا تھا۔ میں نے اپنے ہونٹوں پر روتھ کے اس رات والے بوسے کی گرمی اور خوشبو محسوس کی۔ میرا بدن گرم ہو کر سلگنے لگا۔

NOVELS UPDATE Murtaza A. Siddiqui masom4u@gmail.com

(3)

بوریلا جنکشن والے چوک سے ایک سڑک لائٹ ٹاور کی طرف جاتی تھی۔

اس سڑک کے پہلے چوک میں گوتم بدھ کا ایک مندر تھا۔ مندر کی سیڑھیاں چڑھ کر لوگ اوپر جاتے۔ میں اس مندر میں کبھی نہیں گیا تھا۔ ٹرام پر چوک میں سے گذرتے ہوئے میں نے اس کی سیڑھیوں پر بوڑھی سنہالی عورتوں کو موتیا، چمبہ اور کنول کے پھول بیچتے دیکھا تھا۔ ایک روز ٹرام میں بیٹھا وہاں سے گزر رہا تھا۔ ٹرام بڑی تیزی سے گذر رہی تھی۔ ابھی چوک نہیں آیا تھا کہ میں نے ایک مکان کے لکڑی کے ستونوں والے برآمدے میں ایک لڑکی کو دیکھا۔ اس علاقے میں متوسط طبقے کے خوش حال سنہالی آباد تھے۔ ان میں نوکر پیشہ اور وکیلوں کی تعداد زیادہ تھی۔ ہر مکان کے آگے لکڑی کا برآمدہ تھا۔ لکڑی کا جنگلا لگا تھا۔ اور کہیں کہیں اس جنگلے پر عشق پیچاں کی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ میں ٹرام میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا کہ میں نے دیکھا ایک مکان کے برآمدے میں کھڑی لڑکی جنگلے کے اوپر سے مجھے دیکھ رہی ہے۔ لڑکی کا رنگ گہرا سانولا تھا۔ ماتھے پر سرخ بندیا چمک رہی تھی۔ وہ میری طرف یوں دیکھ رہی تھی جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ میرا سگریٹ ہونٹوں کے پاس ہی آ کر رک گیا اور میں بھی اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ اور ٹرام آگے نکل گئے۔ لڑکی جنگلے کے ساتھ لگی تکتی چلی گئی۔ میں کچھ حیران سا ہو رہا تھا۔ آخر یہ لڑکی کون ہے؟ یہ مجھے اتنی دلچسپی سے کیوں دیکھ رہی تھی۔ میں نے تو اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں اس سے ہزاروں میل دور ایک دور افتادہ شہر میں پیدا ہوا۔ وہیں بڑھا پلا، کبھی ایک دوسرے سے ملاقات نہیں ہوئی۔ پھر ان خاموش آنکھوں میں یہ دوستی کی چمک کیسی تھی؟ بہر حال میں واپسی پر پھر اسی سڑک پر سے گذرا مگر اس وقت وہ لڑکی وہاں موجود نہیں تھی۔ دوسرے روز ٹھیک اسی وقت پر میں پھر ٹرام پر سوار ہو کر وہاں سے گزرا۔ وہ لڑکی برآمدے میں کھڑی شیاما چڑیوں کو چاول ڈال رہی تھی۔ اس نے گیروی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ بال شانوں پر کھلے تھے اور ماتھے پر بندیا لگی تھی۔

ہماری آنکھیں ایک بار پھر چار ہوئیں اور ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ یہاں

تک کہ ٹرام گذر گئی اور ہم ایک دوسرے سے اوجھل ہو گئے۔ میرے شوق کو ہوا لگی۔ اور میں نے اس لڑکی سے عشق کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اگلے روز میں صبح کو پیدل ہی ٹمپل روڈ پر اس لڑکی کے گھر کی طرف چل پڑا۔ اس کے گھر کے سامنے ایک چھوٹا سا ریستوران تھا جس کے کاؤنٹر پر شیشے کے مرتبانوں کے پیچھے ایک مدراسی بیٹھا تلیگو گانوں کے ریکارڈ لگایا کرتا۔ میں اس ریستوران میں آ کر بیٹھ گیا۔ جہاں میں بیٹھا تھا وہاں سے اس لڑکی کے گھر کا برآمدہ اور دروازے پر گرا ہوا سرخ پردہ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ لڑکی وہاں موجود نہیں تھی۔ میں نے کافی منگوالی اور آہستہ آہستہ پینے لگا۔ اس کافی میں ناریل کا دودھ پڑا تھا۔ میں نے سگریٹ سلگا لیا اور اسے پیتے ہوئے لڑکی کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگا۔ ایک ٹرام تیزی سے ٹن ٹن کرتی گذر گئی۔ جب ٹرام آنکھوں کے سامنے سے ہٹی تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہی سانولے رنگ کی لڑکی برآمدے میں لکڑی کے ستون کا سہارا لئے چپ چاپ کھڑی تھی۔ وہ دور جاتی ٹرام کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ کچھ اداس اداس تھا۔ اس کے ہاتھ میں کانسی کی تھالی تھی۔ جس میں چاول پڑے تھے۔ وہ چڑیوں کے لئے زمین پر چاول بکھیرنے لگی۔ چاول بکھیرتے ہوئے اچانک اس کی نگاہیں مجھ سے چار ہو گئیں۔ وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ اور حلق خشک ہو گیا۔ شاید وہ مجھے ٹرام میں تلاش کر رہی تھی۔ اور اسے بالکل توقع نہیں تھی کہ میں اس کے گھر کے بالکل سامنے ریستوران میں بیٹھا اسے محبت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا ہوں گا۔ اس کے چہرے پر بڑا دلکش تبسم ابھر آیا۔ وہ جلدی سے اندر بھاگ گئی۔ تھوڑی دیر بعد پھر واپس آئی تو اس نے بالوں کا جوڑا بنا لیا تھا اور اس جوڑے میں کنول کا ایک پھول مسکرا رہا تھا۔ اس نے گیلی ساڑھی کو نچوڑ کر جنگلے پر ڈالا اور برآمدے میں پڑی ہوئی بانس کی کرسی پر بیٹھ گئی اور کنکھیوں سے مجھے دیکھنے اور زیر لب مسکرانے لگی۔ اتنے میں ایک ادھیڑ عمر کا آدمی جس نے کالا کوٹ پہن رکھا تھا اور ہاتھ میں چھڑی تھی۔ آنکھوں پر سنہری فریم کی عینک لگی تھی۔ دروازہ کھول کر باہر آیا۔ وہ لڑکی کھڑی ہو گئی اور اس نے ساڑھی کا پلو سر پر کر لیا۔ معلوم ہوا کہ یہ اس کا باپ ہے۔ اس آدمی نے چھڑی اٹھا کر جنگلے کے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا دو ایک باتیں کیں اور باہر کی سڑک پر آ گیا۔ سڑک پر وہ ایک رکشے میں سوار ہوا اور بوریلا چوک کے طرف چلا گیا۔

وہ لڑکی پھر کرسی پر بیٹھ گئی اور میز پر رکھا ہوا اخبار اٹھا کر پڑھنے لگی۔ اخبار اس نے

NOVELS URDU LIBRARY
Murtaza Siddiqui
Murtazasiddiqui@gmail.com

ویسے ہی چہرے کے سامنے کر رکھا تھا۔ دراصل وہ اخبار کے ادھر سے اپنی نسواری چمکدار زندگی سے بھرپور آنکھیں کھولے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں بھی دیوانوں کی طرح اسے تکے جا رہا تھا۔ میں تو گویا ایک خواب کی حالت میں تھا۔ اتنے میں ریستوران میں لوگوں کا ہجوم بڑھ گیا اور مجھے اپنی کافی کی پیالی خالی کر کے وہاں سے اٹھنا پڑا۔ جب میں ریستوران سے باہر نکلا تو لڑکی کرسی پر سے اٹھی اور جنگلے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ میں سڑک پر کچھ دور آگے تک گیا اور واپس اس فٹ پاتھ پر ہو لیا جو اس لڑکی کے مکان کے سامنے ہو کر گذرتا تھا۔ جب میں اس لڑکی کے مکان کے سامنے سے گذرا تو گہرے سانولے رنگ کی لڑکی جنگلے کے ساتھ لگی کھڑی تھی اور مجھے مسحور کر دینے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ جانے کس طاقت کے زیر اثر میں وہیں رک گیا۔ میں نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر ہندوستانی میں پوچھا:

"وجے ناتھم جی کی باڈی کدھر ہے؟"

سانولی لڑکی گھبرائی اس کو بالکل توقع نہیں تھی کہ میں اس کے اتنا قریب کھڑا ہو کر اس سے باتیں شروع کر دوں گا اس نے شرما کر کہا:

"معلوم نہیں۔"

اور مجھے تیز تیز گہری نسواری رنگ کی چمکیلی آنکھوں سے دیکھتی گئی۔ میں خاموش ہو گیا۔ اب کیا سوال کروں؟ اب کیا بات کروں؟ ساری باتیں ختم ہو گئی تھیں۔ سارے سوال ختم ہو گئے تھے۔ کیا کہوں؟ کیا کہوں؟ وقت گذر رہا تھا۔ یوں لگا جیسے سارا بازار ہمیں دیکھ رہا ہے۔ میں نے جلدی سے کہا:

"تم مندر جایا کرتی ہو؟"

"ہاں!"

"شام کو؟"

"ہاں۔"

"میں آؤں گا۔"

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اندر سے اس کی ماتا جی نے اسے آواز دی وہ بھاگ کر اندر چلی گئی۔ مجھے پسینہ آ گیا۔ میں جلدی سے فٹ پاتھ پر آگے پل پڑا۔ بوریلا چوک میں آ کر میں نے بس پکڑی اور سیدھا اپنے دفتر آ گیا۔ سارا راستہ اس عجیب و غریب لڑکی کے عجیب و

غریب رومان کے بارے میں سوچتا رہا۔ لڑکی کا تیکھا تیکھا دلکش چہرہ، چمکیلی نسواری آنکھیں، سلگتا ہوا گرم سانولا رنگ اور ماتھے پر چمکتی ہوئی سرخ بندیا اور گہری پر اسرار آواز-------

یہ سب کچھ مجھے بار بار یاد آ رہا تھا۔

دفتر آ کر ابھی میں نے کام شروع ہی کیا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی میں نے رسیور اٹھایا۔ ادھر سے حاجی جبار صاحب بول رہے تھے۔

"سناؤ میاں کیسے ہو!"

"آپ کی دعا ہے حاجی صاحب۔"

"بھائی تم تو ایسے گئے کہ ملنے سے بھی رہے-------- اچھا دیکھو میاں! بچے آج نوکر کے ساتھ تمہارا ریڈیو سٹیشن دیکھنے آئیں گے۔ کسی پاس کی ضرورت تو نہیں ہو گی؟ ------ بھائی اجازت لے رکھنا۔ پرسوں سے انہوں نے میری جان کھالی ہے۔"

میں نے کہا:

"آپ بے شک انہیں بھیج دیں، میں گیٹ پاس کا بندوبست کر لوں گا۔ کس وقت آئیں گے یہ لوگ؟"

"کوئی آدھ گھنٹے بعد۔"

"بہت اچھا۔"

فون بند کر کے میں نے نمبر گھمایا اور مسٹر کانگڑی کو جو گیٹ کا انچارج تھا۔ فون کر کے کہہ دیا کہ کوئی آدھ گھنٹہ بعد میرے ایک دوست کے بچے آ رہے ہیں، انہیں اندر آنے دینا۔ میں پھر اپنے کام میں جُٹ گیا۔ ایک فیچر لکھا۔ ٹرانسمیشن کے لئے لاگ بک لے کر ریکارڈ نکالے۔ ٹرانسمیشن شروع ہونے میں دس منٹ باقی تھے۔

ساتھ والے کمرے میں سے روتھ کے ٹائپ کرنے کی ٹپاٹپ کی آواز برابر آ رہی تھی۔ جب میں ریکارڈ اور لاگ بک بغل میں دبا کر سٹوڈیو میں جا رہا تھا تو برآمدے میں روتھ سے ملاقات ہو گئی۔ وہ اپنے کمرے سے نکل کر میجر حامد کے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔

"ہیلو وصی!"

"ہیلو روتھ۔"

"بادل چھا رہے ہیں شاید آج بارش ہو۔"

NOVELS UIRDU STORIES
Murtaza A. Siddiqui
mascom4u@gmail.com

روتھ مسکرادی۔

"بارش تو یہاں ہوتی ہی رہتی ہے۔"

میں نے ذرا جھک کر کہا:

"کاش کبھی تمہارے لطف و کرم کی بارش بھی ہو۔"

روتھ ہنس پڑی۔ اس کے موتیوں ایسے سفید دانت چمک اٹھے اور مجھے ہلکی سی آنکھ مار کر پاس کے کمرے میں گھس گئی۔ مجھے روتھ کی یہ حرکت بڑی چھچھوری لگی۔ مجھے اچانک ٹمپل روڈ والی سانولی لڑکی کا خیال آ گیا جسے آج شام میں نے مندر میں ملنے جانا تھا۔ کتنی مقدس کتنی خوبصورت اور کس قدر قدیم لڑکی ہے۔ میں سٹوڈیو میں جا کر ٹیبل پر بیٹھ گیا۔ امریکی پروگرام ہو رہا تھا۔ اناؤنسر پول دوسرے سٹوڈیو میں بیٹھا ریکارڈ بجا رہا تھا اور مجھے شیشے سے صاف نظر آ رہا تھا۔ جب ایک منٹ باقی رہ گیا تو اس نے ہاتھ سے مجھے اشارہ کیا۔ سبز بتی دی اور اپنا آخری اعلان کرنے کے بعد سرخ بتی دے کر میرا مائیک اون کر دیا۔ میں نے کہا:

"یہ ریڈیو سی ایک سیلون ہے۔ آج منگل وار ہے۔ اور ہماری پہلی مجلس کا پروگرام شروع ہوتا ہے۔----------:"

میں نے پہلے فوجیوں کو کچھ خبریں سنائیں۔ ریکارڈ بجائے۔ پھر خبریں سنائیں۔ پھر ریکارڈ بجائے۔ ایک ریکارڈ ہوا۔ فیچر سنایا۔ ہندو، پنجابی، تامل اور نیپالی گانوں کے ریکارڈ لگائے۔ ایک نیپالی ریکارڈ اون کر کے میں لاگ بک میں اندراج کر رہا تھا کہ فون کی بتی جلنے بجھنے لگی۔ میں نے رسیور اٹھایا کنٹرول روم سے ھویدار پیارا سنگھ نے بتایا کہ میرے مہمان گیٹ پر پہنچ گئے ہیں اور کانگری کہہ رہا تھا کہ آپ نے تو بچے کہا تھا مگر ان میں جوان لڑکیاں بھی ہیں۔ میں نے خوش ہو کر کہا

"کانگری سے کہو انہیں اندر آنے دے۔"

ریکارڈ ختم ہو رہا تھا۔ میں نے فون بند کر دیا۔ ٹرانسمیشن ختم کر کے جب میں سٹوڈیو سے باہر نکل کر اپنے دفتر میں آیا تو ہاں ریکارڈوں والے ریک کے پاس بچھی کرسیوں پر چھ عدد بچے اور تین جوان پتلی دبلی لڑکیاں بیٹھی لیمن پی رہی تھیں۔ ان میں گل زیب بھی تھی۔ بچے حاجی جبار کے کنبے کے تھے اور باقی دو لڑکیاں گل زیب کی سہیلیاں تھیں۔ ریڈیو سیلون کا پروگرام اگرچہ فوجیوں کے لئے مخصوص تھا مگر کولمبو کی ہندوستانی آبادی میں بے حد مقبول

تھا۔ لوگ اکثر اجازت لے کر ہمارے سٹوڈیو دیکھنے آیا کرتے تھے۔ میں نے گل زیب کو سلام کیا۔ اس نے اپنی سہیلیوں سے میرا تعارف کروایا۔ بچوں سے میرا تعارف پہلے ہی تھا۔ گل زیب کی آنکھوں میں اب بڑی ہمدردی اور ندامت کا احساس تھا۔ جیسے وہ اپنی پچھلی باتوں پر شرمسار ہو۔ اس کا اظہار اس نے بھی کر دیا۔ اس کی سہیلیاں بنگالی لڑکیاں تھیں۔ میں انہیں سٹوڈیوز دکھلا رہا تھا۔ گل زیب نے پنجابی زبان میں مجھ سے کہا۔

"اگرچہ میری وجہ سے آپ کو کبھی ذہنی صدمہ ہوا ہو تو میں اس کے لئے معذرت چاہتی ہوں۔"

میں انجان سا بن گیا۔

"ذہنی صدمہ کیسے گل زیب؟"

"میرا مطلب ہے------ وہ جو ------ وہ جو ایک بار میں نے آپ کو ذرا سا جھڑک دیا تھا اور....."

میں ہنس پڑا۔

"وہ تو تم ایسی خوبصورت لڑکیوں کی عادت میں شامل ہے۔"

گل زیب کا رنگ شرم سے سرخ ہو گیا۔ پھر ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد کہنے لگی۔

"آپ کبھی ہمارے گھر آئے ہی نہیں۔ آپ یقیناً ہم سے ناراض ہیں۔ میں تو آپ کا پروگرام بڑے شوق سے سنا کرتی ہوں۔ کئی بار سوچا کہ آپ کو خط لکھوں یا فون کر کے اپنا پسندیدہ ریکارڈ لگواؤں۔ پھر سوچا آپ بہت مصروف ہوں گے۔"

میں نے کہا:

"ناراضگی کی ایسی کوئی بات نہیں۔ میں حسین لڑکیوں سے کبھی ناراض نہیں ہوتا۔ ہمارے پروگرام شوق سے سنتی ہو۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ اور دیکھو جب کبھی اپنا کوئی پسندیدہ ریکارڈ سننا ہو۔ مجھے فون پر اطلاع کر دیا کرو۔"

گل زیب نے پلکیں جھپکا کر کہا۔

"مصیبت یہ ہے آج کل اگر کوئی لڑکی کسی لڑکے کو فون کرے تو اسے خواہ مخواہ غلط فہمی ہو جاتی ہے۔"

اس کے ساتھ ہی وہ مسکرانے لگی۔

Murtaza A. Siddiqui
mascom4u@gmail.com
NOVELS UPDATES STORIES

میں نے کہا:

"غلط فہمی ہوتی ہے تو ہو جانے دو۔ اس میں تمہارا کیا بگڑتا ہے اور پھر ذرا دو باتیں کر لینے میں کیا حرج ہے؟"

بنگالی لڑکیاں ہماری پنجابی بول چال سے تنگ آ چکی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے بگل زیب سے انگریزی میں کہا:

"بھئی تم لوگ کیا آپس میں باتیں کرنے لگے۔ پھر کسی وقت یہ مسئلہ حل کر لینا۔ ابھی تو ہمیں بہت کچھ دیکھنا ہے۔"

ہم سب ہنس پڑے اور میں ان لوگوں کو لے کر دوسرے سٹوڈیو میں آ گیا۔

شام کو گھر میں غسل کیا بنگالی وضع کا سفید دھوتی کرتہ اور سیاہ چپل پہنی۔ ٹرام میں بیٹھ کر ٹمپل روڈ والے مندر میں آ گیا۔ مندر کے باہر روشنیاں ہو رہی تھیں۔ سیڑھیوں پر عورتیں پھول بیچ رہی تھیں۔ بجاری عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے اور لڑکیاں پھولوں کے گلدستے اور اگر بتیاں لے کر سیڑھیاں چڑھتی مندر میں جا رہی تھیں۔ میں نے ایک طرف کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ مگر وہ سانولی لڑکی مجھے کہیں دکھائی نہ دی۔ میں نے سوچا شاید وہ مندر میں چلی گئی ہے۔ میں نے کنول کے پھولوں کا ایک گچھا خریدا اور سیڑھیوں پر سے ہو کر مندر میں آ گیا۔ پہلے چبوترے کی نیچی چھت سے لٹکتا ہوا گھنٹہ ایک ہاتھ سے بجایا۔ پجاری نے آگے بڑھ کر میرے ماتھے پر تلک لگایا۔ میں نے چار سینٹ کا سکہ صندوقچی میں ڈالا اور مندر کے اندر آ گیا۔

مندر اندر سے بڑا خوبصورت اور شاندار تھا۔ گوتم بدھ کی چھ سات چھوٹی چھوٹی مورتیاں ایک قطار میں بڑے سے استھان پر رکھی تھیں۔ درمیان میں ایک بہت بڑا بُدھ کا بُت تھا۔ یہ بُت کانسی کا تھا اور بجلی کی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دو بڑے سبز رنگ کے موتی جھلملا رہے تھے۔ اس بُت کے چہرے پر ایک عجیب و غریب جلال اور ہیبت تھی۔ پجاری بُت کے پاس کھڑا لوگوں سے دکھشنا وصول کر رہا تھا۔ انہیں اگر بتیاں پھول اور بتاشے دے رہا تھا۔ پجاری چبوترے کے پاس جا کر بڑے بت کے آگے جھکتے، ماتھا ٹیکتے، اُس کے قدموں میں اگر بتیاں سلگاتے، پھول رکھتے اور دعائیں مانگتے واپس ہو جاتے۔

میں ایک طرف پتھر کے ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ کیونکہ میں اس بت کے

آگے سجدہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ خود گوتم بدھ نے اس کام سے منع کیا تھا۔ دوسری وجہ یہ کہ میں اپنے آپ کو گوتم بدھ سے چھوٹا آدمی نہیں سمجھتا۔ پھر میں اس کے آگے سجدہ کیوں کروں؟ بدھ عظیم انسان تھا۔ اس لئے کہ اس نے غریبوں کے دکھ درد کو محسوس کیا اور انسان کی خاطر اپنے محلوں کا عیش و آرام چھوڑ دیا۔ اپنی بیوی اور بچہ چھوڑ دیا۔ میں اس شخص کی عظمت کا مداح ہوں۔ اس کی حیرت انگیز انسانی ہمدردی کے جذبے کی قدر کرتا ہوں۔ مگر اس کی پوجا نہیں کر سکتا۔

میں تو بدھ کے مندر میں اپنی سانولی محبوبہ کی تلاش میں آیا تھا۔ میں بے قرار نظروں سے مندر میں ہر آنے جانے والی کو دیکھ رہا تھا۔ ہر قسم کی عورت وہاں موجود تھی۔ مگر وہ سانولی لڑکی کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں سوچنے لگا کہیں وہ بھول تو نہیں گئی؟ کہیں اس نے کسی دوسرے مندر کا تو نہیں کہا تھا؟ لیکن اس علاقے میں سوائے اس مندر کے اور کوئی مندر نہیں تھا؟ وہ یقیناً آئے گی۔ اس مندر میں آئے گی۔ اے دل ابھی کچھ دیر مزید انتظار کر! ---- جی چاہا کہ سگریٹ سلگا لوں تا کہ انتظار کی کلفت کچھ تو کم ہو مگر مندر میں سگریٹ نہیں پیا جا سکتا تھا۔ پھولی ہوئی توند والے موٹے مہنت کے اشلوک پڑھنے کی آواز میرے کان میں آ رہی تھی۔

اب کچھ عورتوں نے سنہالی زبان میں بھگوان بدھ کی تعریف میں بھجن گانے شروع کر دیئے تھے۔ ان کی آوازیں پُرسکون سمندر کی ہلکی ہلکی لہروں کی طرح اٹھ رہی تھیں اور میرے کانوں سے ٹکرا کر بڑی نرمی سے واپس چلی جاتی تھیں۔ ان کے ساتھ مردنگ اور چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ مندر کی فضاء اگر بتیوں، لوبان، پھولوں اور جوان عورتوں کے صحت مند پسینوں کی بوؤں سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ ایک پل کے لئے تو میرا سر چکرانے لگا۔ میں ستون پر سے اٹھ کھڑا ہوا اور مندر کے صحن میں ادھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ شام گہری ہو رہی تھی اور آسمان پر بادل یوں جھکے ہوئے تھے کہ اب برسے کہ برسے۔ ہوا ایک لخت بند ہو گئی تھی اور فضاء میں حبس ہو گیا تھا۔ میں نا امید ہو گیا۔ اب وہ لڑکی نہیں آئے گی۔ اب اس کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں اداس ہو کر صحن سے ہو کر مندر کی سیڑھیوں کی طرف آ گیا۔ ابھی میں گھنٹے والے چبوترے میں ہی تھا کہ میں نے دیکھا وہی گہرے سانولے رنگ کی لڑکی کانسی کی چھوٹی سی تھالی میں لوبان اور کنول کی ادھ کھلی کلیاں رکھے سفید ساڑھی

NOVELS URDU STORIES
Murtaza A. Siddiqui
rascom4u@gmail.com

کا دامن سنبھالے آہستہ آہستہ مندر کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی میں چبوترے کے ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا اور ان لوگوں کی طرح بار بار گھٹنے پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ جنہیں گوتم بدھ سے بڑی محبت ہوتی ہے۔

چبوترے پر آ کر اس نے مجھے دیکھا اور نظریں چھپا کر چپکے سے مندر کے دروازے میں داخل ہو گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے ہی مندر میں چلا گیا۔ اس نے میرے سامنے بدھ کے چرنوں میں اگربتیاں روشن کیں۔ پھول رکھے۔ ماتھا ٹیکا۔ بدھ کے قدموں کی راکھ لے کر اپنی مانگ میں لگائی اور چھوٹی مورتیوں کے گرد چکر لگانے لگی۔ میں وہاں سے کھسک کر باہر صحن میں آ گیا۔ کیونکہ پجاری کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا تھا جو اس سے پہلے مجھے وہاں دیکھ چکا تھا۔ صحن میں آ کر ایک ستون کے پاس کھڑا ہو گیا۔ لڑکی مندر کی ڈیوڑھی سے باہر نکل رہی تھی۔ دہلیز کے پاس ایک پل کے لیے رک کر اس نے چاروں طرف دیکھا۔ مجھ سے نظریں چار ہوئیں تو چپکے سے نگاہیں جھکا لیں اور صحن کی پرلی جانب کو چل دی۔ میں اس کے پیچھے ہو لیا۔ اب وہ مندر کے چھوٹے چھوٹے ستونوں کے درمیان سے گذر رہی تھی۔ اس کے بالوں کے جوڑے میں سفید پھول لگے تھے اور جسم سے خوشبو اٹھ رہی تھی۔ اس خوشبو کی لہریں مجھ تک آ رہی تھیں۔ میں اس کے قریب ہو گیا۔ ایک جگہ صحن میں کسی بدھی بھکشو کا چھوٹا سا مجسمہ بنا ہوا تھا۔ لڑکی اس مجسمے کے پاس جا کر رک گئی اور ذرا سا جھک کر اس کے قدموں میں پھولوں کی کلیاں ارپن کرنے لگی۔ میں قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ لڑکی کو میرے اتنا قریب ہونے کا شدید احساس تھا اور وہ تیز تیز سانس لے رہی تھی۔ اس کا گھرا سانولا رنگ سلگ رہا تھا۔ ماتھے پر بندیا چمک رہی تھی۔ اور ہونٹوں پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے لرز رہے تھے۔ میں نے جھک کر اس کی تھالی میں سے کنول کی ایک کلی اٹھائی اور اسے چوم کر بت کی قدموں پر رکھتے ہوئے کہا۔

"تم نے دیر کر دی۔"

لڑکی کچھ نہ بولی۔ اس نے گہرا سانس لیا آنکھیں اٹھا کر گہری اور گرم نظروں سے میری طرف دیکھا اور آگے چل دی۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ اب ہم جہاں سے گذر رہے تھے وہاں روشنیاں کم تھیں اور ہلکا ہلکا اندھیرا چھا رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے اس لڑکی کا بازو تھام لیا۔ وہ کانپ گئی اور وہیں رک گئی۔ اس کا بازو گداز تھا۔ اور گرم ہو رہا تھا۔

"تم کون ہو؟"

میرے اس سوال پر اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کی نسواری آنکھوں میں اجنٹا کے غاروں کی تاریک گہرائیاں جھانک رہی تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی مجھے ان گنت صدیوں کے دبیز دھندلکوں کے پیچھے سے دیکھ رہا ہے۔ وقت کا چکر ایک بار رک کر پیچھے کو چلنا شروع ہو گیا تھا۔ ان جانے چہرے دکھائی دے رہے تھے۔ ان سنی باتیں سنائی دے رہی تھیں۔ ان چھوئے جسم مَس ہو رہے تھے۔ ان کہی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ مجھ پر جیسے کسی نے جادو کر دیا تھا۔ میں بے حس ہو کر کھڑا تھا۔ لڑکی نے پلکیں جھکا لیں۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کی ہتھیلی میں پسینہ آیا ہوا تھا۔ اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"میں ٹرام میں بیٹھا تمہیں دیکھا کرتا تھا۔ تم بھی مجھے دیکھا کرتی تھیں۔ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے ہم نے اس سے پہلے بھی ایک دوسرے کو کہیں دیکھا ہے۔ ہم اس سے پہلے بھی ایک دوسرے سے کہیں ملے ہیں اچھا بتاؤ تمہارا نام کیا ہے۔"

لڑکی نے آہستہ سے آنکھیں اٹھائیں اور پر اسرار آواز میں آہستہ سے بولی:

"ایلورا۔"

کس قدر مقدس اور قدیم نام تھا اس کا! اس نام میں ہزار سالوں کی تاریخ دفن تھی۔ ان گنت صدیوں کی گرد اڑ رہی تھی۔ پرانے مندروں کے کھنڈرات میں اُگے ہوئے جنگلی پھولوں کی پرانی مہک تھی۔ ایلورا ----- ایلورا ----- اس نام میں مندروں کی گھنٹیوں کی صدا تھی۔ میں نے پوچھا۔

"ایلورا! ----- ایلورا! مجھے تم سے پریم ہو گیا ہے۔ مجھے تم سے ہمیشہ پریم ہوا ہے اور ہمیشہ پریم رہے گا۔ ایلورا! تم بڑی پراسرار لڑکی ہو تم کیا کرتی ہو؟"

اس نے ذرا مسکرا کر کہا:

"گھر میں ماں جی کا ہاتھ بٹاتی ہوں۔ چڑیوں کو چاول ڈالتی ہوں۔"

وہ بڑی صاف ہندوستانی میں بات کر رہی تھی۔ اس کی آواز میں جادو تھا اور لہجے میں سنگیت رچا ہوا تھا میں نے کہا

"تم نے مجھے پہلی بار اس طرح کیوں دیکھا تھا؟ کیا تمہیں کچھ یاد آ گیا تھا؟"

Murtaza A. Siddiqui
murtazascom4u@gmail.com
NOVELS URDU

ایلورا ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ اس نے گھوم کر مورتی کی طرف دیکھا جو سامنے دیوار میں بنی ہوئی تھی ایک گہرا سانس لیا اور نظریں جھکا لیں۔ میں نے پھر اپنا سوال دہرایا۔ اُس نے اِس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے اصرار کیا تو گھبرا سی گئی اور جلدی سے بولی۔

"میں جاتی ہوں ماں جی راہ دیکھ رہی ہوں گی۔"

میں نے فوراً کہا:

"ایلورا پھر کب ملو گی؟"

"نہیں معلوم۔"

"ایسا نہ کہو ایلورا! میں اب تمہیں دیکھے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اگر تمہارے درشن نہ ہوئے تو میں مر جاؤں گا۔"

"شی۔"

ایلورا نے میرے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ اس انگلی میں سے حنا کی خوشبو آ رہی تھی۔ میں تو اس کی اس بے ساختہ حرکت پر حیران رہ گیا۔

"ایسا نہیں کہا کرتے۔"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر لیا۔ اُس نے آہستہ سے ہاتھ چھڑا لیا۔

"میں چلی۔"

"کل آؤ گی۔"

"نہیں۔"

"پرسوں۔"

"نہیں۔"

"ایسا نہ کہو ایلورا! نہ کہو ۔۔۔۔۔ میں تمہیں پھر بھی ملنا چاہتا ہوں۔ ضرور ملنا چاہتا ہوں۔ تمہارے درشن کرنا چاہتا ہوں۔ تم سے بہت سی باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔ تم سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ تم کون ہو؟ تم پہلے کہاں تھیں؟ تم اس کے بعد کہاں ہو گی؟ ہم اس عظیم ملاپ کے بعد جدا ہو کر پھر کہاں ملیں گے؟ کب ملیں گے؟"

میں بولے جا رہا تھا اور ایلورا چپ چاپ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ منہ سے کچھ نہیں بول رہی تھی۔ نسواری چمکیلی آنکھیں کھلی تھیں۔ ہونٹ بند تھے۔ سانولا رنگ نکھر کر

سرخ ہو رہا تھا۔ ہونٹوں پر پسینے کی بوندیں جھلملا رہی تھیں۔ کانوں میں پڑے ہوئے بُندوں کے سبز پتھر دمک رہے تھے۔ جب میں خاموش ہو گیا تو اس نے بڑی محبت سے میرے ہونٹوں کے اوپر آیا ہوا پسینہ اپنی انگلی سے پونچھا اور آہستہ سے بولی:

"تم کہاں سے آئے ہو؟"

"امرتسر سے ۔۔۔۔۔ پنجاب سے۔"

اس نے ایک لمبا سانس لیا۔

"پنجاب سے ۔۔۔۔۔ ہندو نہیں ہو؟"

"مسلمان ہوں۔"

اس نے سر جھکا لیا۔ وہ ایک دم غمگین ہو گئی۔ پھر ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم نمودار ہوا۔ مجھے بڑی ہی نرم اور محبت سے بھری ہوئی نظروں سے دیکھا اور بولی۔

"شدنی ہو کر رہتی ہے۔ تم کہاں؟ میں کہاں؟"

پھر آہ بھر کر بولی۔

"میں چلی۔"

میں اُس کی کوئی بات نہ سمجھ سکا تھا۔ وہ تو گویا میری طرف دیکھتے ہوئے اپنے آپ سے یا کسی دوسرے سے مخاطب تھی۔ جب وہ جانے لگی تو میں اس کے سامنے آ گیا۔

"میں کل پھر یہاں آؤں گا۔"

میں یہاں اب نہیں آؤں گی۔"

"کیا مجھ سے ناراض ہو گئی ہو ایلورا؟"

"نہیں۔"

"پھر کیوں نہیں آؤ گی۔"

"اس کا انجام ٹھیک نہیں ہو گا۔"

"پر یم انجام نہیں دیکھا کرتا ایلورا۔"

ایلورا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اداس آواز میں بولی۔

"میں اگلے منگل وار کو آؤں گی۔"

اتنا کہہ کر اس نے اچانک ہاتھ چھوڑ دیا اور مندر کے ستونوں میں سے گزرتی تیز تیز

NOVELS URDU STORIES
Murtaza A. Siddiqui
mascom4u@gmail.com

قدم اٹھاتی مندر کی سیڑھیوں کی طرف جا کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ کچھ دیر میں بالکل بت بنا وہاں کھڑا رہا۔ پھر جب مجھے ہوش آیا تو ماتھے پر آیا ہوا پسینہ پونچھتا مندر کی سیڑھیوں کی طرف چل دیا۔ مندر سے باہر آیا تو دیکھا کہ بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ باہر آ کر میں نے سگریٹ سلگایا۔ اس کے دو تین کش لئے اور فٹ پاتھ پر پیدل ہی گھر کی طرف چل پڑا۔ مجھ پر ایک پرسرار کیفیت طاری تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میں ایک ہزار برس پہلے کا آدمی ہوں اور تاریخ کے اوراق میں سے نکل کر کولمبو کی سڑکوں آ گیا ہوں۔ جب ایلوار کا گھر آیا تو میں دوسرے فٹ پاتھ پر ہو گیا۔ اس کے گھر کے اندر روشنی ہو رہی تھی۔ دروازے کا پردہ ہوا میں ہل رہا تھا۔ برآمدہ ویران تھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ اب بوندا باندی نے ہلکی بارش کی صورت اختیار کر لی تھی۔ میرے کپڑے بھیگنے لگے تھے۔ میں نے رکشا لیا اور سیدھا گھر آ گیا۔

(4)

ساری رات بارش ہوتی رہی۔

سمندر کی طرف سے تیز رفتار برساتی ہواؤں کے جھکڑ چلتے رہے۔ ہوا ناریل کے درختوں میں چیختی رہی۔ بارش کوٹھی کی ڈھلانی چھتوں پر دھڑا دھڑ برستی رہی۔ کھانا کھا کر میں بستر پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر تک پڑھتا رہا۔ بارش کے شور میں کان پڑتی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ خواہ مخواہ جی چاہ رہا تھا کہ اٹھ کر کھڑکی کھول دوں اور بارش کا نظارہ کروں۔ یا اس بھری برسات میں باہر سڑکوں پر نکل جاؤں اور دیوانہ وار گھومتا پھروں۔ میں نے سگریٹ بجھا کر کتاب پرے پھینکی اور اٹھ کر لان کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھول دی۔ ہوا نے بارش کی بوچھاڑ اندر پھینک دی۔ میں نے کھڑکی بند کر دی۔ ہوا کے تھپیڑے سے میز پر رکھا ہوا لکڑی کا گلدان فرش پر گر پڑا۔ مجھے نیند بالکل نہیں آ رہی تھی۔ گھڑی دیکھی۔ ابھی صرف رات کے نو ہی بجے تھے۔ میں نے برساتی پہنی اور کمرے پر تالا ڈال کر باہر آ گیا۔

سڑک پر ٹرامیں اور بسیں گزر رہی تھیں۔ لوگ برساتیاں پہنے۔ چھتریاں لگائے تیز تیز قدموں سے اپنے گھروں کو جا رہے تھے۔ ہوٹلوں میں ریکارڈ لگے ہوئے تھے۔ بارش کے شور میں ریکارڈوں کے گانے کی آواز دب گئی تھی۔ سرخ پھولوں والے درختوں نے اپنی ٹہنیوں کو جھاڑ جھاڑ کر سڑک پر سرخ پتیوں کا جال بچھا دیا تھا۔ یہ پتیاں مینہ کے پانی میں بہہ کر سڑک کے کنارے آ رہی تھیں۔ اوپر آنکھ اٹھا کر دیکھا تو ناریل کے درختوں میں سے پانی کی آبشاریں سی نیچے فٹ پاتھ پر گر رہی تھیں۔ کولمبو کی بارش واقعی بڑی موسلادھار تھی۔ عمارتوں کے فلیٹوں میں روشنیاں ہو رہی تھیں۔ روشندان کھلے تھے۔ لیکن سڑک پر پردے کھنچے ہوئے تھے۔

میں بوریلا چوک سے سلیو آئی لینڈ کی طرف پیدل ہی چل پڑا۔ بارش میں پیدل چلنے کا بھی اپنا ایک الگ مزہ ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ فٹ پاتھ پختہ ہو اور اوپر درخت جھکے ہوئے ہوں اور راستے میں لاہور کی سڑکوں والے خوفناک مین ہول نہ ہوں۔

سلیو آئی لینڈ سے ہو کر میں سمندر کی طرف آ گیا۔ گال میٹس ہوٹل کے ساتھ والی بیچ

NOVELS URDU STORIES
Murtaza A. Siddiqui
mascom4u@gmail.com

پر میں لوہے کے جنگلے کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ میری پیٹھ کولمبو شہر کی طرف تھی اور منہ سمندر کی طرف تھا۔ رات کو سمندر کالا اور ہیبت ناک دکھائی دے رہا تھا اور تیز بارش میں سمندر کی سطح پر دھند اٹھ رہی تھی۔ زبردست لہریں بڑی تیزی سے اٹھ اٹھ کر ساحل سے ٹکرا رہی تھیں۔ تیز ہوا میں میری برساتی کا دامن پھڑ پھڑا رہا تھا۔ سمندر کی مرطوب ہوا میں مچھلیوں اور کھارے پانی کی بو تھی۔

کتنی ہی دیر میں وہاں کھڑا اپنے وطن کے گلی کوچوں اور مدراسی لڑکی ایلورا کے بارے میں سوچتا رہا۔ دونوں کی یاد ایک ایسی شدت سے میرے دل میں موجزن تھی۔ میں آواگون کا اتنا زیادہ قائل نہیں ہوں مگر اس وقت مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں پہلے جنم میں یہاں ضرور پیدا ہوا ہوں اور ایلورا سے اس سے پہلے بھی مل چکا ہوں۔ مجھ سے زیادہ اس بات کا ایلورا کو زیادہ یقین تھا۔ اگرچہ ابھی اس نے اس کا مجھ سے ذکر نہیں کیا تھا۔ لیکن اس کی باتوں اور میری طرف گہری گہری پر سرار نگاہوں سے دیکھنے کے انداز نے اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا تھا۔

سمندر والے جنگلے سے ہٹ کر میں گال روڈ پر آگے کی طرف چل پڑا۔

گال مینس ہوٹل سے آگے گزر کر کوٹھیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان کوٹھیوں کے عقب میں سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ کوٹھیوں میں روشنیاں ہو رہی تھیں۔ بارش اب کچھ ہلکی ہو گئی تھی۔ ہر تیسری کوٹھی کے بعد ایک ایک چھوٹی سی پتلی سڑک بغل سے ہو کر دور ناریل کے جھنڈوں میں سے ہوتی ہوئی سمندر کی طرف نکل گئی تھی۔ ایسی پتلی دبلی سڑکوں پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ بادل زور سے گرجا اور موسلادھار بارش ایک بار پھر شروع ہو گئی۔ موٹر کاروں اور بسوں کی تیز روشنیوں میں گرتی بارش کی لڑیاں جھلملانے لگیں۔ بنگلوں کے صحنوں میں اگے ہوئے پپیتے اور کیلے کے درختوں کی ٹہنیاں ہوا کے سامنے جھک گئیں اور یوں محسوس ہونے لگا جیسے بارش کا خیر مقدم کر رہی ہوں۔ میں جنرل مرچنٹس کے ایک سٹور میں آ گیا۔ اس خیال سے کہ بارش سے بچ کر سگریٹ پی لوں گا۔ سٹور میں کچھ عورتیں اور مرد ضرورت کی چیزیں خرید رہے تھے۔ مجھے بھی سگریٹ کا ایک ٹین خریدنا پڑ گیا۔ ٹین خرید کر میں نے اسے کھولا۔ اور وہیں کاؤنٹر کے ساتھ لگ کر سگریٹ سلگایا۔ اچانک میری نظر روتھ پر پڑ گئی۔

وہ سامنے والے کاؤنٹر پر کھڑی بانس کی ٹوکری میں صابن کا ڈبہ اور چٹنی کی بوتل رکھ رہی تھی۔ میں چپکے سے اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مجھے دیکھا تو مسکرا کر بولی:

"رات کو بارش میں گھومنا بڑا اچھا ہوتا ہے۔"

میں نے سگریٹ کا کش لے کر کہا۔

"لیکن اکیلے کبھی نہیں۔"

وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ ہم سٹور سے باہر آ گئے۔

"تم میرے ساتھ گھر کیوں نہیں چلتے۔ گھر چل کر میں تمہیں فرنچ کافی پلاؤں گی۔"

میں تو یہی چاہتا تھا۔ فوراً بولا۔

"میں بڑے شوق سے پیوں گا۔"

باہر روتھ کی ٹیکسی کھڑی تھی۔ ہم ٹیکسی میں بیٹھ کر روتھ کے بنگلے میں آ گئے۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ روتھ گال مینس روڈ پر ایک بنگلے کے کونے والے عقبی دو کمروں میں رہتی تھی۔ دونوں کمرے چھوٹے تھے لیکن اس نے خوب سجا رکھے تھے۔ پہلا کمرہ نشست گاہ کا کام دیتا تھا اور وہ دوسرے کمرے میں اس کی خواب گاہ تھی۔ اس نے دروازہ کھول کر کمرے میں بتی جلائی۔ مجھے بیٹھک میں بٹھلایا اور خود اتنا کہہ کر خواب گاہ میں چلی گئی۔

"میں ذرا کپڑے بدل آؤں۔"

بیٹھک میں دیواروں پر امریکی ایکٹرسوں کی نیم عریاں تصویریں لگی تھیں اور کونے والے میز پر ایک ننگی جشن کالکشمی کا مجسمہ کھڑا تھا۔ کھلی کھڑکی میں سے بارش کے شور کے ساتھ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اندر آ رہے تھے۔ میں میز پر سے رسالے اٹھا کر دیکھنے لگا۔ میں نے برساتی اتار کر کھونٹی سے لٹکا دی تھی۔ میرے کپڑے تھوڑے تھوڑے بھیگے ہوئے تھے۔ لیکن پنکھے کی تیز ہوا میں فوراً سوکھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد روتھ نمودار ہوئی۔

اس نے شب خوابی کا باریک ریشمی لباس پہن رکھا تھا۔ جس میں اس کے بھرے بھرے جسم کے گول خطوط صاف دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے بجلی کی کیتلی میں پانی ڈال کر بٹن دبا دیا اور میرے سامنے صوفے پر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگی۔

"آج تو بارش نے دھوم مچا رکھی ہے۔ کولمبو میں برسات شروع ہو گئی ہے۔ اب یہ سلسلہ کئی مہینوں چلے گا۔"

Murtaza A. Siddiqui
mascom4u@gmail.com
NOVELS STUDIES URDU

میں نے روتھ کے سینے کے نیم عریاں ابھار پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔

"تم یہاں اکیلی رہتی ہو روتھ؟"

روتھ نے حیرانی سے کہا۔

"اس میں حرج ہی کیا ہے۔"

"حرج تو کوئی نہیں میں بھی اکیلا ہی رہتا ہوں۔ لیکن یہ دور اکیلے رہنے کا نہیں۔ انسان کو کوئی نہ کوئی ساتھی ضرور تلاش کر لینا چاہیئے۔"

روتھ نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔

"میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ ساتھی ہمیشہ تکلیف اور پریشانی کا باعث بنتے ہیں۔ میں اکیلی ہوں جس وقت چاہے آؤں۔ جس وقت چاہے نکل جاؤں۔ کوئی اعتراض کرنے والا نہیں لیکن اگر میرا کوئی ساتھی از قسم خاوند یہاں رہتا ہو تو میں اتنی آزادی سے کبھی نہیں گھوم پھر سکتی۔ وہ تو اپنی پابندیوں سے میرے ناک میں دم کر دے گا۔ کیا تم شادی کے حق میں ہو وصی؟"

میں نے مسکرا کر کہا۔

"شادی کو میں انسانی سماج کی سب سے بڑی بدنصیبی سمجھتا ہوں۔ اس حادثے نے رونما ہو کر انسانی زندگی کو ٹی بی کا مریض بنا کر بستر پر ڈال دیا ہے۔ مگر میں اس کے ساتھ ہی یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ کوئی مرد عورت کے بغیر اور کوئی عورت مرد کے بغیر مکمل نہیں کہلوا سکتی۔ ان دونوں کا ملاپ ناگزیر ہے۔"

"ٹھیک ہے لیکن یہ ملاپ دوستانہ اور کبھی کبھی ہونا چاہیئے۔ نہ اس طرح کہ ایک مرد عورت کی گردن پر ایک عورت مرد کے سر پر سوار کر دی جائے۔ اس طرح تو یہ نہ صرف یہ کہ دونوں جنسوں کی تذلیل ہوتی ہے۔ بلکہ اچھی بھلی زندگی جہنم بن کر رہ جاتی ہے۔ میں اسی لئے اپنے خاوند سے علیحدہ ہو گئی تھی۔ ایک تو ہمارے مزاجوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔"

میں نے کہا۔

"لیکن روتھ! تمہارے ہاں تو لڑکی لڑکا کورٹ شپ کے ذریعے ایک دوسرے کے مزاجوں کو پوری طرح پرکھ لیتے ہیں۔ تم لوگوں کو کم از کم یہ شکایت نہیں کرنی چاہیئے۔"

روتھ ہنس پڑی اور ایش ٹرے میں سگریٹ جھاڑ کر بولی۔

"بات اصل میں یوں ہے کہ ایک مزاج شادی سے پہلے کا ہوتا ہے اور ایک شادی کے بعد کا ہوتا ہے۔ یہ دونوں مزاج ایک دوسرے کا بھید کبھی نہیں کھولتے۔ جب تک کہ شادی نہیں ہو جاتی۔ میں نے جس شخص سے شادی کی تھی۔ میں اُسے پانچ سال سے جانتی تھی۔ اس نے ان پانچ سالوں کے دوران میں کبھی مجھ سے بدسلوکی نہیں کی تھی۔ کبھی بُری طرح پیش نہیں آیا تھا۔ لیکن شادی کے بعد آہستہ آہستہ اس کی کایا پلٹنی شروع ہو گئی۔ شادی کی دھوپ میں جوں جوں تالاب کا پانی سوکھتا گیا نیچے سے کنکر پتھر روڑے اینٹیں اور چیتھڑے نظر آنا شروع ہو گئے۔ وہی شخص جس نے کبھی مجھ سے غصے میں بات نہیں کی تھی۔ اب میری صورت سے بیزار ہو گیا اور بات بات پر مجھے جھڑکنے لگا۔ ایک بار تو اس نے مجھے پیٹ بھی ڈالا۔ بس پھر کیا تھا میں نے اس سے طلاق لے لی۔ میرا تو یہ ایمان ہے کہ ایک مرد سے دس سال تک بغیر شادی کے ملتی رہیں تو اس کے رویئے میں ذرا فرق نہیں آئے گا۔ وہ ہمارا بدستور گرویدہ رہے گا۔ مگر جونہی شادی کریں گی تو دوسرے ہی برس اس میں فرق آجائے گا اور وہ ہمیں گھر میں چھوڑ کر دوسری عورتوں کے پیچھے بھاگنا شروع کر دے گا۔ میں نے تو اب شادی پر کان پکڑ لیئے ہیں۔"

"تو کیا تم باقی عمر اسی طرح گذار دو گی۔"

روتھ مجھے دیکھ کر مسکرائی۔

"خاوند کی بجائے میں دوستوں میں زیادہ خوش رہتی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے بدن کو ننگا کر کے اس پر کارپوریشن کے بکروں کی طرح صرف ایک آدمی کی مہر لگا دی جائے اور اس آدمی کو یہ حق دے دیا جائے کہ وہ چاہے تو اس جسم کو گھر کے نعمت خانے میں سجا کر رکھ دے اور چاہے تو اس جسم کو آگ پر بھون کر کھا جائے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

باہر بارش اسی طرح ہو رہی تھی۔ کھلی کھڑکی میں سے سمندر کی تیز ہوا اور لہروں کا شور صاف سنائی دے رہا تھا۔ میں نے روتھ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"تم ایسے خوبصورت جسم کی صحت مند عورت کو ایک آدمی کے حوالے کر دینا پوری انسانیت کی توہین ہے۔"

روتھ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ اس کے دلکش قہقہے کی آواز بارش کے شور میں مجھے صاف صاف اور الگ تھلگ سنائی دی۔ کافی کی ایک پیالی پینے کے بعد روتھ نے سگریٹ سلگا کر کہا۔

NOVELS URDU STORIES
Murtaza A. Siddiqui
mascom4u@gmail.com

"آج میرا کھانا ایک سہیلی کے ہاں تھا۔ میں وہیں سے واپس آرہی تھی کہ تم مل گئے۔ کھانا کھاؤ گے؟"

میں نے کہا۔

"نہیں ----- میں گھر سے کھانا کھا کر نکلا تھا۔"

روتھ نے میری طرف جھک کر کہا۔

"پنکھا بند کر دوں۔ بارش کی وجہ سے کچھ خنکی ہو گئی ہے۔"

واقعی کمرے میں ہلکی ہلکی ٹھنڈ ہو گئی تھی۔ بارش اور ٹھنڈی تیز ہوا نے گرمی کو بھگا دیا تھا۔ روتھ نے اٹھ کر پنکھا بند کر دیا اور الماری میں سے اطالوی وائین کی بوتل اور دو گلاس نکال کر میز پر رکھ دیئے۔

"میرا خیال ہے تمہیں ڈاکٹروں نے منع نہیں کیا۔ کیوں؟"

میں ہنس پڑا۔

"مجھے ڈاکٹر نے کسی بھی چیز سے منع نہیں کیا روتھ۔"

"یہ بڑی اچھی بات ہے۔"

ہم دونوں اطالوی وائن پینے اور باتیں کرنے لگے۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد ہم دونوں شراب کے سرور میں تھے۔ بارش اسی طرح تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ہو رہی تھی۔ روتھ کا چہرہ سرخ ہو کر دمک رہا تھا۔ وہ سگریٹ پر سگریٹ پی رہی تھی۔ اس کے ہونٹ جل رہے تھے۔ آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے سلگنے لگے تھے۔ وہ صوفے پر ایک طرف کچھ اس طرح سے جھکی ہوئی تھی کہ مجھے اس کے سینے کا ایک حصہ بالکل ننگا دکھائی دے رہا تھا۔ اسکے ایک ہاتھ میں سگریٹ تھا اور دوسرے ہاتھ میں وائن کا نصف پیا ہوا گلاس۔ اس کے سنہری بال کھڑکی میں سے اندر آتی ہوئی سمندر کی ہوا میں اڑ رہے تھے۔ کچھ وقت اور گزر گیا۔ روتھ کو نشہ چڑھ گیا۔ وہ سگریٹ کے ساتھ سگریٹ جلاتی اور پیا ہوا سگریٹ ایش ٹرے میں بجھانے کی بجائے کھڑکی میں سے باہر جھاڑیوں میں پھینک دیتی جہاں بارش نے طوفان مچا رکھا تھا۔ وہ ہمارے ریڈیو کے باس کے خلاف باتیں کرنے لگی۔

"بڑا ڈرٹی آدمی ہے۔ دفتر میں ہی مجھے گود میں بٹھلا کر میرا منہ چومتا ہے اور میری ٹانگیں سہلاتا ہے۔ مجھے یہ باتیں پسند ہیں لیکن ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے اور پھر اس کے

منہ سے جلے ہوئے پیاز کی بدبو آتی ہے۔ میں تو ایسے آدمی کو ایک پل کے لئے بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ ایک پل کے لئے بھی نہیں مسٹر وصی ----- اب تم ہو۔ میں نے اس روز تمہارا منہ چوما تھا تو مجھے سگریٹ کی خوشبو آئی تھی۔ اور تم نے اس رات میرے گھر کے اندر آنے پر ذرا بھی اصرار نہیں کیا تھا۔ یہ بات مجھے بڑی پسند آئی تھی۔ اگر تم زبردستی اندر گھس آتے تو پھر تم میں اور خاوند میں کیا فرق رہ جاتا۔ پھر شادی ہی کیوں نہ کر لوں؟ تمہیں پتہ ہے کہ ایک روز ہمارا باس زبردستی میرے گھر میں شراب پی کر آ گیا تھا۔ اس نے میرے ساتھ بدسلوکی کی۔ مگر کیا کرتی مجبور تھی۔ نوکر جو ہوئی۔ اتنے پیسے مجھے یہاں کسی پرائیویٹ فرم میں نہیں مل سکتے جتنے ریڈیو سیلون سے مل رہے ہیں۔ لیکن میں جانور نہیں ہوں۔ کیا میں جانور ہوں مسٹر وصی؟"

مجھے بھی نشہ ہو گیا تھا۔ ہم نے نصف بوتل سے زیادہ وائن پی لی تھی۔ میں نے سگریٹ راکھ دان میں دبایا تو راکھدان الٹ گیا۔

"اوہ! آئی ایم سوساری۔"

"کوئی بات نہیں ----- ہاہاہا ----- تم نشے میں ہو وصی ----- ہاہاہا۔"

میں نے جلدی سے حواس جمع کرتے ہوئے کہا۔

"نشہ تو مجھے تمہیں دیکھ کر ہی ہو گیا تھا۔ ادھر سے یہ اطالوی وائن بڑی تیز ہے۔ پھر تم میرے سامنے ہی نہیں بیٹھی ہو بلکہ مجھے خود پلا رہی ہو۔ اس اعتبار سے تو مجھے دو بوتل کا نشہ ہونا چاہیئے۔"

روتھ! اس مشرقی خیال سے بڑی محظوظ ہوئی اور خوب ہنسی۔ پھر اٹھ کر باتھ شب خوابی کے گاؤن کی جیبوں میں ٹھسا کر کمرے میں ٹہلنے لگی۔ تیز ہوا میں اس کا ریشمی گاؤن اس کے جسم سے لپٹ کر اس کے گول اور گداز خطوط کو زیادہ نمایاں کرنے لگا۔ میرے بدن میں بجلی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ کوئی ایک گھنٹہ بعد روتھ اپنے پہلے خاوند کی سنگ دلی کے قصے سنا رہی تھی۔

"وہ سخت سردی میں مجھے ننگا کر کے کہا کرتا تھا کہ جا کر فرش دھوؤ۔ ایک روز کم بخت نے بارش میں مجھے گھر سے نکال دیا۔ وہ خود بھی جانور تھا اور مجھے بھی جانور سمجھ رہا تھا۔ ایک روز اُس نے اِس بری طرح سے مجھے پیٹا کہ میں نے جا کر تھانے میں رپٹ لکھوا دی۔ یہ دیکھو۔

NOVELS URDU LINKS
Mumtaz A. Siddiqui
mumtaz4u@gmail.com
Mumtaz A. Siddiqui

اس کی مار کے نشان ابھی تک میرے جسم پر ہیں۔"

اتنا کہہ کر اس نے کندھے پر سے کپڑا ہٹایا اور شانے پر مجھے زخم کا نشان دکھانے لگی۔ زخم کا نشان نظر آنے سے پہلے مجھے اس کے سینے کا ایک پورا حصہ ننگا نظر آ گیا۔ میری آنکھوں میں رنگ برنگے ستارے ٹوٹنے لگے۔ اس نے بھی میری نظروں کی چوری پکڑ لی تھی۔ جلدی سے کندھے پر کپڑا درست کر کے مسکرائی اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

"ہر مرد میں تھوڑا بہت جانور ضرور ہوتا ہے۔ اس وقت میں نشے میں ہوں۔ میرے منہ سے سچی باتیں نکلیں گی۔ برا نہیں ماننا۔ ویسے تم مجھے پسند ہو۔ آج رات بارش کی رات ہے۔ کولمبو میں بارش کی راتیں بڑی گرم ہوتی ہیں۔ ان بارش میں بھیگی ہوئی گرم راتوں میں بڑے بڑے پتھر دل پگھل جاتے ہیں۔ کیا تم جانتے ہو عورت کی حقیقت کیا ہے؟ نہیں تم ابھی اس راز کو جاننے کے لئے بڑے چھوٹے ہو۔ ابھی تمہیں ایک عمر اس تجربے کو حاصل کرنے کے لئے چاہیئے۔"

روتھ نے میرے قریب آ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہم دونوں کھلی کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ روتھ نے بتی گل کر دی۔ کمرے میں اندھیرا چھا گیا گرتی بارش کے شور میں سمندر کی لہروں کا شور مدغم ہو رہا تھا۔ کھڑکی کے باہر بھیگا ہوا اندھیرا پرتشے پر گیلے کمبل کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ روتھ نے اپنا بازو میری کمر کے گرد حمائل کر دیا۔ اور اپنا خوبصورت سر میرے کندھے سے لگا دیا۔ ہم دونوں جھول رہے تھے۔ روتھ کے گداز صحت مند جسم کی گرمی میرے تشنہ اور دہکتے ہوئے بدن میں حلول کر رہی تھی۔ میری آنکھیں سلگ رہی تھیں اور حلق خشک ہو رہا تھا۔ میں نے پانی پیا۔ روتھ جھومتی ہوئی خواب گاہ میں چلی گئی۔

اس نے اندر جا کر بڑی محبت سے مجھے آواز دی۔ میں اندر گیا اس نے خواب گاہ کی کھڑکی کا پردہ چن دیا تھا اور کھڑکی کی سل پر بیٹھی سگریٹ پی رہی تھی۔ اس کا گاؤن ٹانگوں پر سے کھسک گیا تھا اور وہ نیم عریاں حالت میں تھی۔ میں اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

روتھ نے اندھیرے میں چمکتی ہوئی نشیلی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور سل سے اتر کر مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کا سگریٹ کھڑکی سے باہر گر پڑا۔ وہ میرے بازوؤں میں سما گئی تھی اور اس نے اپنا پورا بوجھ مجھ پر گرا دیا تھا۔ میں اسے اٹھا کر پلنگ پر لے آیا۔ پلنگ پر لٹا

کر میں نے اس کا سر سرہانے پر رکھا اور چادر اس کے اوپر کر دی۔ جب میں آہستہ سے اس کا منہ چوم کر پیچھے ہٹنے لگا تو روتھ نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور اپنے دونوں بازو میری گردن میں ڈال دیئے۔

"بارش ہو رہی ہے ناں؟"

"ہاں۔"

"سمندروں کا شور سنائی دے رہا ہے ناں؟"

"ہاں۔"

"ناریل کے جنگل پانی میں بھیگ گئے ہیں کیا؟"

"ہاں روتھ۔ بارش نے جل تھل ایک کر دیا ہے۔"

"پھر تم اس وقت کہاں جاؤ گے؟"

"اپنے گھر۔"

"بڑے نادان ہو۔ کیا یہ گھر تمہارا نہیں؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ مجھے کسی دوست کی ضرورت نہیں؟ آج کی رات تم یہیں سو جاؤ۔ اس بارش میں کہاں جاؤ گے۔"

میں نے کہا۔

"لیکن روتھ۔۔۔۔"

روتھ نے اپنا ہاتھ میرے ہونٹوں پہ رکھ دیا۔

"تمہیں زندگی کے تجربات حاصل کرنے ہیں۔ تمہیں ایسی کئی بارش والی راتیں گھر سے باہر گزارنی پڑیں گی۔ کیا تم ہر ڈراؤنی رات میں اپنے گھر کو یاد کر کے اداس ہو جاؤ گے؟ نہیں میرے پیارے! تم ایسا نہیں کرو گے۔ زندگی بار بار اپنی سنہری کھڑکی نہیں کھولا کرتی۔"

اس کے ساتھ ہی روتھ نے مجھے اپنے ساتھ لٹا لیا۔ اس نے چادر اور اپنا گاؤن پرے پھینک دیا۔ کمرے کے نیم اجالے میں مجھے اس کے سرخ و سپید عظیم الشان جسم کے سارے خطوط عریاں نظر آ رہے تھے۔ اس کے سینے کا ابھار دھڑک رہا تھا۔ کچھ کہہ رہا تھا۔ کچھ سن رہا تھا۔ لیکن میں کچھ بھی نہیں سن رہا تھا۔ وہاں صرف بارش کی آواز تھی۔ سمندر کی طرف سے آنے والا لہروں کا شور تھا۔ روتھ کے جسم کی پکار تھی۔ میرے انگ انگ کی دھڑکنیں

NOVELS URDU
Murtaza A. Siddiqui
mascom4u@gmail.com

تھیں۔ اس کے دہکتے ہوئے ہونٹوں کا شیریں رس تھا اور میرے خشک ہونٹوں کا پھیلا ہوا تشنہ دامن تھا۔ خوشبو تھی۔ گرم خوشبو سے مہکا ہوا گھنا جنگل تھا۔ وہاں نہ روتھ تھی۔ نہ میں ہی تھا۔ رات تھی۔ بارش تھی۔ سمندر کی کف اڑاتیں غضبناک لہریں تھیں۔ آگ و خون کے جہنم میں جلتے ہوئے پھول تھے۔ خون آلودہ چاک داماں کلیاں تھیں۔ کانٹے تھے۔ خاردار جھاڑیوں پر گری ہوئی گرم شبنم تھی اور کچھ نہیں تھا۔ روتھ نے میرے کانوں پر اپنے ہونٹ رکھ کر ہلکی سی آہ بھری اور اپنا سر میرے بازوؤں میں چھپا دیا۔ میرا چہرہ روتھ کے خوشبو اڑاتے سنہری اور ریشم کی طرح ملائم بالوں میں گم ہو گیا اور پھر بارش تیز اور تیز ہو گئی اور کھڑکی کے پٹ بجنے لگے۔ پردہ دیوانوں کی طرح لہرانے لگا اور ناریل کے درختوں کی لچکیلی ٹہنیاں طوفان میں دُہری ہو گئیں اور سمندر کا شور وحشتناک ہو گیا۔

NOVELS URDU STORIES
Murtaza A. Siddiqui
mascom4u@gmail.com

5

یوں تو ریڈیو سیلون کے عملے کا ہر آدمی مس روتھ سے عشق کرتا تھا۔ لیکن صوبیدار پیارا تو اس پر بری طرح لٹو ہو گیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ روتھ کو دیکھ کر مجھے اپنی بیوی ہربنس کور یاد آجاتی ہے۔ میں نے صوبیدار پیارا سنگھ کو کہا۔

"مگر صوبیدار روتھ کا رنگ تو بے حد گورا اور سرخ ہے اور بال بھی سنہری ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ پنجاب کی عورتوں میں یہ تین چیزیں شاذ ہی اکٹھی ملتی ہیں۔"

پیارا سنگھ ریچھ کی طرح خرخرا کر بولا۔

"بال اور رنگ نکال دیں اور سامنے ہو بہو ہربنس کور کھڑی ہے۔ میرا بس چلے تو میں اسے اٹھا کر لے جاؤں۔"

"مگر کہاں لے جاؤ گے؟ ہربنس کور کے پاس جس کی اس سے شکل ملتی ہے۔"

پیارا سنگھ ہنسنے لگا۔

"اجی گھر کون کا فر لے جائے گا۔ اس کا تو میں اسی شہر میں ایک سال تک بھوجن کر سکتا ہوں۔"

تو معلوم ہوا کہ پیارا سنگھ دراصل بیوی کو نہیں روتھ کو پیار کرتا ہے اور بیوی کا محض ایک بہانہ ہی ہے۔ ہو سکتا ہے روتھ کی تھوڑی بہت شکل ہربنس کور سے ملتی ہو۔ لیکن حقیقت میں پیارا سنگھ روتھ کا بھوجن کرنا چاہتا ہے۔ پیارا سنگھ اونچا لمبا جوان سکھ تھا۔ چہرہ گول اور بالوں میں چھپے ہوئے سفید دانت، سرخ سرخ اندر کو دھنستی ہوئی آنکھیں ----- فوجی گیریژن میں دوسرے فوجیوں کے ساتھ ایک بارک میں رہتا تھا جس کی چھت پھونس کی تھی۔ روز رات کو شراب پیتا۔ کچھا اور بنیان پہن کر بھالو ایسے جسم پر بالوں کا گھنا جنگل پھیلائے شراب پی کر میرٹھ کے حوالدار قریشی کے پلنگ کے ارد گرد جھومتا جھامتا چکر لگاتا اور پھر بال کھول کر زمین پر بیٹھ جاتا اور اپنی بیوی ہربنس کور کو آوازیں دینی شروع کر دیتا۔ ساتویں پیگ پر اسے بیوی بھول جاتی اور مس روتھ کی یاد میں اونچی اونچی آہیں بھرنی شروع کر دیتا۔ آدھی بوتل پینے کے بعد وہ نشے میں دھت ہو جاتا اور قریشی کے پاس جا کر کہتا۔

"سالے میرٹھ کے کتّے! تیری اردو میں ایک منٹ میں ساری کی ساری نکال سکتا ہوں۔ تو چھٹی پر میرٹھ گیا اور میرے لئے قینچی نہیں لایا۔ بہنی یاوے میرٹھ میں سوائے استرے قینچیوں کے اور رکھا ہی کیا ہے۔ قینچی نہیں لایا اور گڑمڑ گڑمڑ کرتی اردو لے آیا۔ ابھی ایک ایسا گھونسا دوں گا کہ اردو کے ساتھ سارے دانت باہر آجائیں گے۔۔۔۔۔"

حوالدار بے چارہ چپکے سے ایک طرف ہو کر پڑا رہتا۔ اس نے کبھی میجروں سے شکایت نہیں کی تھی۔ کیونکہ وہ پیارا سنگھ سے ڈرتا تھا اور پھر پیارا سنگھ بھی صرف شراب میں اس کی اردو کی مخالفت کرتا تھا۔ اسے صرف اردو بولنے والوں سے بیر تھا۔ کیونکہ وہ کہا کرتا۔

"یہ لوگ مرچیں بہت کھاتے ہیں اور جھوٹ بہت بولتے ہیں۔ بیوفا تو ہوتے ہیں اور اپنے دوست کو ضرور دھوکا دیتے ہیں۔"

میں نے اسے کئی بار سمجھایا کہ ہر اردو بولنے والا ایسا نہیں ہوتا اور پھر اس قسم کی برائیاں تو ہر قوم کے افراد میں پائی جاتی ہیں۔ مگر صوبیدار پیارا سنگھ کی موٹی عقل میں یہ بات بالکل نہیں آتی تھی۔ زیادہ شراب پی کر وہ روتھ کو یاد کر کے اپنا جوڑا کھول دیتا اور رونا شروع کر دیتا۔ وہ روتھ روتھ کر کے اسے پکارتا اور بار بار میری جان روتھ میری معشوقہ روتھ کہہ کر حوالدار قریشی سے لپٹ لپٹ جایا کرتا۔ اس بیرک میں فوجیوں نے صوبیدار پیارا سنگھ کا اچھا خاصا مذاق بنا رکھا تھا۔ صبح جب وہ دفتر آتا تو روتھ کو دیکھ کر شرما جایا کرتا اور اس سے کبھی آنکھ نہ ملاتا۔ روتھ کو علم تھا کہ صوبیدار پیارا سنگھ اس کا عاشق ہے۔ وہ اس خیال سے بڑی خوش ہوا کرتی اور کبھی کبھی محض مزہ لینے کے لئے اور اپنی خود پسندی کو تسکین دینے کی خاطر اس کی حوصلہ افزائی بھی کر دیا کرتی تھی۔ وہ سب کے سامنے اس سے مسکرا کر بات کر لیا کرتی اور کبھی کبھی یہ بھی کہہ دیتی۔

"اب کے اگر میں نے شادی کی تو پیارا سنگھ سے کروں گی۔"

پیار سنگھ کا چہرہ خوشی سے مسکرانے لگتا۔ وہ ان باتوں کو سچ سمجھے ہوئے تھا۔ اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہ رہتا۔ جب دفتر والے اسے سمجھاتے کہ روتھ اس سے مذاق کر رہی ہے تو اسے یقین ہی نہ آتا۔ وہ کہتا۔ تم سب جلتے ہو۔ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ میں تم سب سے طاقت ور ہوں۔ روتھ دراصل غلطی کر رہی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ آگ سے کھیل رہی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ایک روز ایسا ہوا کہ روتھ دفتر میں بیٹھی کچھ کاغذات سامنے

رکھے ٹائپ کر رہی تھی کہ پیارا سنگھ نے اسے باہر بلایا اور شام کو کھانے کی دعوت دے دی۔

روتھ مسکرا دی اور یہ سوچ کر کہ اس کا دل نہیں توڑنا چاہیئے۔ اس کی دعوت قبول کر لی۔ پیارا سنگھ تو خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ سارا دن وہ اس خیال سے ناچتا رہا کہ شام کو روتھ اس کے ساتھ ہوٹل میں کھانا کھائے گی۔ اس نے دفتر میں چپڑاسی تک کو بتا دیا کہ آج وہ دفتر سے جلدی چلا جائے گا۔

"کیونکہ روتھ کی اس نے دعوت کر رکھی ہے۔"

شام کو وہ پورے فوجی لباس میں روتھ کو لے کر ایک ہوٹل میں آگیا۔ یہ ساری باتیں مجھے بعد میں معلوم ہوئیں۔ روتھ محض پیارا سنگھ کا دل رکھنے کے لئے اس کے ساتھ ہو گئی تھی۔ ہوٹل میں کھانا کھانے کے بعد دونوں گال روڈ پر سمندر کے کنارے سیر کرتے رہے۔ پیارا سنگھ کی تو گویا عید ہو گئی تھی۔ وہ روتھ کے کندھے سے کندھا ملائے چل رہا تھا۔ اور اس کے گدرائے ہوئے سینے کے ابھار کو ہوس ناک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اسے ہر بنس کور بھول گئی تھی۔ اب تو صرف روتھ اس کے سامنے تھی اس کے ساتھ تھی اور کسی جتن سے اس کا بھوجن کرنا چاہتا تھا۔ اس نے روتھ کے ڈر کے مارے شراب نہیں پی تھی۔ ایک تو اس لئے کہ کہیں روتھ اس کا برا نہ مانے دوسرے اس خیال سے بھی شراب پی کر وہ عام طور پر آپے سے باہر ہو جایا کرتا تھا۔ اسے ڈر تھا کہیں وہ نشے میں روتھ کی بے عزتی نہ کر بیٹھے۔ روتھ نے پیارا سنگھ کا دل مزید خوش کرنے کے لئے کہا۔

"آؤ تمہیں اپنا گھر دکھاؤں۔ دیکھو گے؟"

پیار سنگھ خوش ہو کر بولا۔

"کیوں نہیں سجنو۔۔۔۔۔ ہم کو تو تم وہیں رکھ لو؟"

روتھ ہنس پڑی وہ اسے ساتھ لے کر اپنے گھر آگئی۔ وہاں پہنچ کر اس نے عادت کے مطابق وائن پینی شروع کر دی۔ صوبیدار پیارا سنگھ کو دعوت دی تو اس نے وسکی مانگی۔ روتھ نے وسکی کی بوتل میز پر رکھ دی۔ اب دونوں شراب پینے لگے۔ صوبیدار پیارا سنگھ دیکھتے ہی دیکھتے آدھی بوتل اور پھر پونی بوتل پی گیا۔ وہ ماجھے کا جٹ تھا۔ شراب کو پانی سمجھ کر پینے کا عادی تھا۔ روتھ ذرا انگریزی فیشن سے پی رہی تھی۔ اور پیارا سنگھ گلاس بھر بھر کر خالی کر رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ روتھ پر ابھی سرور کا عالم تھا کہ صوبیدار پیارا سنگھ نشے میں دھت ہو گیا۔ اس کا

Murtaza A. Siddiqui
masoom4u@gmail.com
NOVELS URDU SOCIETY

پہاڑ ایسا سر گردن پر دائیں بائیں گھومنے لگا اور بھالو ایسا بدن جھولنے لگا۔ اس کی آنکھیں چڑھ گئیں۔ اور وہ بار بار روتھ کے سینے کو دیکھ کر ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ روتھ کو کچھ خوف سا محسوس ہوا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

"اب چلنا چاہیئے مسٹر پیارا سنگھ۔"

لیکن مسٹر پیارا سنگھ ماجھے کا جٹ بن گیا تھا۔ اس نے غرا کر کہا۔

"آپاں تو ایتھے ہی رہوں گا۔"

روتھ سمجھ گئی کہ معاملہ خراب ہو گیا ہے۔ اب اس ریچھ سے بچنا مشکل ہے۔ وہ ایسی عورت نہیں تھی کہ اپنی عصمت کو بچانے کی خاطر کھڑکی سے چھلانگ لگا دیتی۔ پھر بھی وہ ایک اچھے ذوق کی مالک تھی۔ اسے یہ بات کبھی پسند نہیں تھی کہ کوئی اس کے ساتھ زبردستی کرے۔ جب اس نے دیکھا کہ صوبیدار پیارا سنگھ کسی طرح وہاں سے ہلتا ہی نہیں تو اس نے کہا۔

"اچھا تم یہاں آرام کرو۔ میں ذرا باہر ٹہل آؤں۔"

اتنا کہہ کر وہ باہر نکلنے لگی تو صوبیدار پیارا سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ہاتھی کی طرح کھڑے کھڑے جھول رہا تھا۔ اس نے روتھ کو کلائی سے پکڑ لیا اور اپنی طرف کھینچ کر بولا۔

"ہم کو اکیلا چھوڑ کر کہاں جا رہی ہو ہر بنس کور تم میری بیوی ہو۔ آج اتنی دیر بعد ملی ہو۔ مجھے بھوجن تو کر لینے دو۔"

روتھ نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ مگر پیارا سنگھ کی مضبوط گرفت سے کلائی چھڑانا آسان کام نہیں تھا۔ پیارا سنگھ نے دروازے کی چٹخنی لگا دی۔ روتھ نے سوچا کہ وہ شور مچا دے۔ پھر خیال آیا ایسا کرنے سے وہ محلے میں بدنام ہو جائے گی۔ پھر دفتر والوں کو معلوم ہے کہ روتھ نے اس کی دعوت خود قبول کی تھی۔ اس کے علاوہ اسے پیارا سنگھ کی فولادی گرفت میں ایک طرح کی لذت کا احساس بھی ہوا تھا۔ اس کے باوجود روتھ نے ہاتھ پاؤں مارے اور اپنے آپ کو پیارا سنگھ کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کی۔ مگر پیارا سنگھ فنا فی ہو رہا تھا اور روتھ اس کے سامنے تھی۔ وہ مر سکتا تھا۔ مگر روتھ کو کبھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اس نے روتھ کو اپنے سینے سے چمٹا لیا اور پے در پے اس کا منہ چومنے لگا۔ روتھ نے اپنا سانس روک لیا۔ لیکن کب تک؟ پیارا سنگھ اسے کھینچتا ہوا دوسرے کمرے میں لے گیا اور

پلنگ پر گرا دیا۔ روتھ نے غصے میں کہا۔

"میں تمہیں صبح کوارٹر گارڈ میں بند کرا دوں گی۔ آخر تم نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔ میں ایسی ویسی عورت نہیں ہوں۔ میں شور مچا دوں گی۔"

صوبیدار پیارا سنگھ نے جیب سے فٹ بھر لمبا چاقو نکال کر اس کی نوک روتھ کے سینے پر رکھ دی۔ روتھ کا جسم ٹھنڈا پڑ گیا۔ وہ بے حس ہو کر پلنگ پر لیٹ گئی۔ پیارا سنگھ نے چاقو میز پر رکھ دیا اور روتھ کا گاؤن کچھ اس طرح کھینچا کہ وہ پھٹ گیا۔

اس رات صوبیدار پیارا سنگھ نے کچھ اس طرح بھوجن کیا کہ روتھ بیمار ہو گئی۔ پیارا سنگھ بھی اس ہفتے چھٹی لے کر کانڈی چلا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ روتھ ضرور باس سے اس کی شکایت کر دے گی اور اسے کوارٹر گارڈ میں بند کر کے اس پر مقدمہ چلایا جائے گا۔ مگر روتھ نے ایسا نہ کیا۔ تین روز بیمار رہنے کے بعد وہ بھلی چنگی ہو کر دفتر آ گئی اور آتے ہی اس نے پیارا سنگھ کا پوچھا۔ ہفتے بعد پیارا سنگھ دفتر آیا تو اس کی آنکھیں اوپر نہیں اٹھ رہی تھیں۔ روتھ نے اسے دیکھا اور اس کے قریب آ گئی۔ پیارا سنگھ کی روح خشک ہو گئی۔ روتھ نے قریب آ کر کہا۔

"صوبیدار میں نے تمہاری شکایت نہیں کی اس لئے کہ اب میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔"

پیارا سنگھ تو ہکا بکا رہ گیا۔

اس واقعے کے بعد روتھ پیارا سنگھ پر بہت مہربان ہو گئی اور ہفتے کی شام اسی کے ساتھ بسر کرتی۔ دونوں کسی ہوٹل میں جا کر کھانا کھاتے۔ وہاں سے روتھ اسے گال روڈ پر اپنے گھر لے جاتی۔ رات کو وہیں بھوجن ہوتا اور صبح سارا دن وہ سمندر کے کنارے سیریں کرتے پھرا کرتے۔ میجر حامد کو یہ بات سخت ناگوار محسوس ہوئی مگر وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا کیونکہ یہ روتھ کا ذاتی معاملہ تھا اور پھر وہ فوج کی باقاعدہ ملازمہ بھی نہیں تھی۔ صوبیدار پیارا سنگھ کے تو پاؤ بارہ ہو گئے تھے۔ وہ اپنی ساری تنخواہ روتھ پر خرچ کر دیتا۔ وہ ہر بنس کور اپنی بیوی کو بھول گیا تھا۔ اس کا خط آتا تو غصے میں اسے لکھتا۔ "بکواس بند کرو۔ تم مجھے آرام سے نوکری کرنے دو گی یا نہیں؟ میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔ بس واہگورو جی کی فتح!"

منگل وار کی شام کو میں اپنی محبوبہ ایلورا سے ملنے شام کو مندر آ گیا۔

Murtaza A. Siddiqui
masoom4u@gmail.com

مندر میں پچھلے منگل وار کی طرح اچھی خاصی چہل پہل تھی۔ پجاری اور پجارنیں ہاتھوں میں کنول کے پھول اور کانسی کی تھالیوں میں لوبان لئے کشاں کشاں چلی آرہی تھی۔ میں نے اس روز بھی ہندووانہ لباس یعنی بنگالی دھوتی کرتا پہن رکھا تھا۔ اس خیال سے کہ کسی کو میرے غیر ہندو ہونے کا شک نہ ہو۔ ایلورا ابھی تک نہیں آئی تھی۔ میں کچھ دیر مندر میں ہی ادھر ادھر ٹہلتا رہا۔ پھر ایک جگہ ذرا پرے ہٹ کر ستون کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد مجھے ایلورا مندر میں داخل ہوتی دکھائی دی۔ بالوں کے جوڑے میں کنول کا پھول سجا رکھا تھا۔ ہاتھ میں تھالی تھی۔ جس میں لوبان سلگ رہا تھا۔ وہ چپکے سے مندر کے اندر چلی گئی۔ مجھے معلوم تھا پوجا کرنے کے بعد وہ باہر آکر مجھے دیکھے گی۔ چنانچہ میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد ایلورا مندر کے دروازے سے باہر صحن میں آگئی۔ اس نے دور ہی سے مجھے دیکھ لیا تھا۔ میرے قریب آکر وہ رک گئی۔ میں نے کھڑے ہو کر اسے نمستے کیا۔ اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا آج اس کے کانوں میں سرخ پتھروں والے بندے تھے اور ناک میں جو کیل پڑی تھی اس میں سبز پتھر چمک رہا تھا۔ ماتھے پر سرخ تلک لگا تھا اور گہرا سانولا چہرہ اسی طرح چمک رہا تھا۔

ہم نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کی۔ صحن میں سے ہو کر ہم ایک تنگ سی سیڑھیاں چڑھ کر مندر کی چھت پر آکر بیٹھ گئے۔ یہاں قدرے اندھیرا تھا اور سڑک کے کنارے اُگے ہوئے درخت کی شاخیں چھت کے منڈیر پر جھکی ہوئی تھیں۔ ایلورا نے کانسی کی تھالی زمین پر رکھ دی اور گھٹنے جوڑ کر اس طرح بیٹھ گئی کہ اپنی تیکھی ٹھوڑی گھٹنوں پر رکھ دی اور مجھے گہری گہری نگاہوں سے دیکھ کر مسکرانے لگی۔

میں نے کہا۔

"میں نے ایک ہفتہ تمہاری یاد میں تڑپ تڑپ کر گزارا ہے ایلورا۔ میں گھڑیاں گن رہا تھا۔ میں کئی بار تمہارے مکان کے سامنے سے بھی گزرا مگر تم ایک بار بھی دکھائی نہیں دیں۔ کیا تم باہر گئی ہوئی تھیں؟"

ایلورا نے اپنی بڑی بڑی سیاہ پلکیں جھپکا کر سرگوشی ایسی آواز میں کہا۔

"میں اپنی ماسی کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ کل آئی ہوں۔"

ایلورا نے آنکھیں جھکالیں اور شرما کر ہونٹ دانتوں تلے داب لئے۔ میں نے اس کا

نازک اور گرم ہاتھ تھام لیا؟"

"بتاؤ ایلورا! کیا تم بھی مجھے یاد کیا کرتی تھیں؟"

ایلورا نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلادیا۔

"ایسے نہیں ایلورا مجھے زبان سے بتاؤ۔"

ایلورا نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور پھر آہستہ سے بولی

"ہاں۔"

"کیا ہاں؟"

"میں بھی یاد کرتی تھی۔"

میں نے جلدی سے کہا۔

"کسے؟"

"تمہیں۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے شرما کر اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپالیا اور میں نے دیکھا کہ اس کے جوڑے میں لگا ہوا کنول کا پھول میری طرف دیکھا کر مسکرا رہا تھا۔ مندر کی چھت پر ہلکی ہلکی روشنی میں وہ ایک بہت بڑا ستارہ معلوم ہو رہا تھا۔ جو دو محبت کرنے والوں پر جھک کر اپنی روشنی پھیلا رہا ہو۔ میں نے دونوں ہاتھوں میں لے کر ایلورا کا خوبصورت چہرہ اوپر اٹھایا۔ اس وقت ایلورا مجھے گوتم بدھ کے زمانے کی کوئی دیوداسی معلوم ہو رہی تھی۔ گہری چمکیلی پراسرار آنکھیں، سیاہ بالوں میں لگا ہوا کنول کا سفید پھول، کانوں میں سرخ پتھر، ناک میں چمکتا ہوا سبز نگ اور گہرے سانولے سلگتے ہوئے رخسار اور تیکھی ناک ------ ایلورا مسکرا رہی تھی۔ اور میں تاریک راتوں کے جنگل میں تنہا کھڑا ہوں اور اپنشد کے عہد کی کوئی زنگی بانس کے درختوں میں سے جھانک کر مجھے دیکھ رہی ہے اور اپنے پاس بلا رہی ہے۔ میں نے کہا۔

"ایلورا! میں نے اس سے پہلے بھی تمہیں دیکھا ہے۔"

ایلورا ذرا سا مسکرا کر خواب ایسی آواز میں بولی۔

"میں نے بھی تمہیں دیکھا ہے۔"

"لیکن کہاں؟ میں نہیں جانتا۔"

"میں جانتی ہوں۔"

Murtaza A. Siddiqui
mascom4u@gmail.com
NOVELS URDU LIBRARIES

"پھر بتاؤ۔ خدا کے لئے جلدی بتاؤ۔"

ایلورا نے اپنی آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔ ٹھنڈی سانس بھری اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"اب چلنا ہے۔"

"اتنی جلدی؟"

"ماتا جی راہ دیکھ رہی ہوں گی۔"

"پھر کب ملاقات ہو گی ایلورا؟"

"اگلے منگل کو۔"

"نہیں نہیں ایلورا! میں ہفتہ ہفتہ بھر تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کسی طرح مجھے پہلے بھی ملو۔ کیا تم سمندر کے کنارے نہیں آسکتیں؟"

ایلورا کی آنکھیں فرش پر تھیں اور کانسی کی تھالی اس نے سینے سے لگا رکھی تھی۔ بڑے اداس لہجے میں بولی۔

"اس سے کیا حاصل ہو گا؟"

میں نے بے تاب ہو کر کہا۔

"پریم میں پریتم کے درشن ہی سب کچھ ہوتے ہیں ایلورا مجھے تم سے مل کر شانتی ملتی ہے۔ میری روح کو چین نصیب ہوتا ہے۔"

ایلورا نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"لیکن میں بے چین ہو جاتی ہوں۔ میری روح کی شانتی مجھ سے چھن جاتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ میں نہیں جانتی۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں مجھ سے پریم نہیں ایلورا۔"

ایلورا نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

"پریم سے بھی بڑھ کر میں تمہاری پوجا کرتی ہوں۔ میں نے ہر جنم میں تم سے پریم کیا ہے۔ اور ہر جنم میں پریم کرتی رہوں گی۔ لیکن یہ خیال ستاتا ہے کہ ہر جنم کی طرح اس جنم میں بھی تم مجھ سے جدا ہو جاؤ گے۔ مجھے چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ چلے جاؤ گے اور میں روتی ہوئی اکیلی رہ جاؤں گی۔"

میں نے ایلورا کا ہاتھ چوم کر کہا۔

"میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا ایلورا۔ میں ہمیشہ تمہیں اپنے ساتھ رکھوں گا۔ میں تم سے شادی کر لوں گا۔"

ایلورا نے جلدی سے میرے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"بھگوان کے لئے ایسا نہ کہو۔ دیوتا سن رہے ہوں گے۔ وہ ہم پر اپنا عذاب نازل کر دیں گے۔ جو بات ہو نہیں سکتی اس کا ذکر ہی نہ کرو۔"

"کیوں نہیں ہو سکتی ایلورا؟"

ایلورا نے اداس لہجے میں کہا۔

"اس لئے کہ تم کسی دوسرے مذہب سے تعلق رکھتے ہو۔ میں دوسرے مذہب کی لڑکی ہوں۔ ہمارا تمہارا ملاپ اس دنیا میں کبھی نہیں ہو سکتا۔ کبھی نہیں ہو سکتا۔ ہم تو شروع ہی سے جدا ہونے کے لئے ملتے رہے کیونکہ بھگوان کی یہی مرضی ہے۔"

میں نے ایلورا کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیے۔

"تم گوتم بدھ کی ماننے والی ہو اور گوتم بدھ کا کوئی مذہب نہیں تھا۔ وہ دنیا میں صرف محبت اور پریم کا پیغام لے کر آیا تھا۔ اس نے ہمیشہ ٹوٹے ہوئے دلوں کے رشتے جوڑے ہیں۔ کیا وہ ہماری شادی سے ناراض ہو سکتا ہے؟"

"بھگوان بدھ ناراض نہیں ہوں گے۔ مگر مذہب کے پجاری ضرور ناراض ہو جائیں گے۔ بھگوان بدھ مذہبی نہیں تھے لیکن ان کی باتیں مذہب بن گئی ہیں۔ میرا گھرانہ ہندو بدھسٹ گھرانہ ہے۔ تم مسلمان ہو۔ پھر ذرا سوچو ہمارا تمہارا ملاپ کیسے ہو سکتا ہے؟"

میں نے کہا۔

"کیا ہم دونوں اپنے اپنے مذہب کو چھوڑ نہیں سکتے ایلورا؟"

ایلورا نے ہلکی سی آہ بھری اور کہا۔

"یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ہمیں کسی نے ایسی رسیوں میں جکڑ دیا ہے جو موت کے بعد بھی نہیں کھل سکتیں۔ اچھا اب میں جاتی ہوں۔"

"کیا کل سمندر پر آؤ گی؟"

"نہیں نہیں۔۔۔۔۔ میں نہیں آسکتی۔"

Murtaza A. Siddiqui
mascom4u@gmail.com
NOVELS UIRDU STORIES

"تمہیں کون روکتا ہے۔ تم جہاں چاہو جا سکتی ہو۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی نہیں روکتا۔ لیکن میں خود اپنے آپ کو روکتی ہوں۔ میں خود اپنے آپ سے ڈرتی ہوں۔"

"یہ تمہارا وہم اور نا سمجھی ہے ایلورا! ہم دو پریمی ہیں۔ ہمیں زیادہ سے زیادہ ایک دوسرے کے پاس رہنا چاہیئے۔ کیا خبر کب ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔"

"ایسا نہ کہو ---- ایسا نہ کہو۔ میں آؤں گی۔ تم سے ملنے ضرور آؤں گی۔ مگر کل نہیں۔ پرسوں آؤں گی۔"

"کہاں"

"تم دو بجے لائٹ ٹاور کے پاس میرا انتظار کرنا۔"

"میں ٹاور کے پاس والی مارکیٹ کے دروازے پر کھڑا ہوں گا۔"

"اچھا۔"

میں نے آگے بڑھ کر اپنے ساتھ لگا لیا اور اس کا منہ چوم لیا۔ ایلورا کا گرم جسم کانپنے لگا۔ اس کے خشک انگارہ ایسے جلتے ہونٹوں نے میرے جسم میں آگ لگا دی۔ وہ جلدی سے بھاگ کر چھت کی سیڑھیاں اتر گئی۔ میرے ہونٹوں پر ابھی تک ایلورا کے ہونٹوں کی آگ اور خوشبو تھی۔ میں کتنی ہی دیر بت بنا مندر کی چھت پر بیٹھا رہا۔ پھر چپکے سے اٹھا اور نیچے اتر آیا۔

6

صبح دفتر آ کر بیٹھا ہی تھا کہ گل زیب کا فون آ گیا۔ اس نے فون پر مجھے بتایا کہ آج اس کی سالگرہ ہے اور مجھے اس میں شرکت کرنی ہوگی۔ میں نے کہا کہ اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ گل زیب کی سالگرہ ہو اور میں اسے اپنی آنکھوں کے سامنے خوبصورت لباس میں چلتے پھرتے دیکھوں۔

"آپ بہت جلد رومانٹک ہو جاتے ہیں۔ بہرحال شام کو ضرور آیئے گا۔ آپ کے نام دعوت نامہ پوسٹ کر دیا گیا ہے۔ آج مل جائے گا۔ میں نے کل بھی آپ کو فون کیا تھا مگر آپ دفتر سے غائب تھے۔ آپ آج کل کہاں گھومتے رہتے ہیں؟"

"خیابان سے جدا ہو کر ہرن صحرا میں بھٹک رہا ہے گل زیب۔"

مجھے گل زیب کے قہقہہ لگا کر ہنسنے کی آواز سنائی دی۔

"آپ پھر رومانٹک ہو گئے اچھا خدا حافظ میں انتظار کروں گی۔"

"میں تمہیں انتظار نہیں کرنے دوں گا۔"

"بڑی اچھی بات ہے۔ خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔"

میں دفتر سے نکل کر سیدھا مارکیٹ میں گیا۔ وہاں اس فکر میں مختلف سٹالوں پر منڈلانے لگا کہ زیب کے لئے کون سا تحفہ خریدا جائے۔ کشمیری شال؟ نہیں! مدراسی ساڑھی؟ حاجی جبار کے ہاں ساڑھی کا کیا کام! جانماز؟ البتہ ---- ! مگر اس مارکیٹ میں جانماز کا ملنا مشکل تھا۔ نہیں تو زیب کے لئے جانماز سے بہتر تحفہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ میں نے جلدی میں وہاں سے چین کا بنا ہوا ایک بڑا خوبصورت ٹی سیٹ اور بنگلور کا بنا ہوا ایک نازک ہینڈ بیگ خرید لیا اور ٹیکسی میں بیٹھ کر حاجی صاحب کی کوٹھی آ گیا۔

شام ہو رہی تھی۔ سورج سمندر کی طرف غروب ہو رہا تھا۔ آسمان پر اکا دکا تارے نکلنے لگے تھے اور کوٹھیوں کے آس پاس ہلکا ہلکا اندھیرا چھانے لگا تھا۔ گل زیب کی کوٹھی برقی قمقموں سے جگ مگ جگ مگ کر رہی تھی۔ مہمان گاڑیوں سے اتر اتر کر اندر جا رہے تھے۔

Murtaza A. Siddiqui
mascom4u@gmail.com
NOVELS URDU

میں بھی گاڑی سے اُترا اور کوٹھی کے اندر داخل ہو گیا۔ برآمدے میں حاجی صاحب بڑے تپاک سے ملے۔ گلے بھی لگایا۔

"یار تم تو عید کا چاند ہو گئے ہو۔ کبھی ملاقات ہی نہیں ہوئی۔"

حاجی صاحب کی بیگم بھی خندہ پیشانی سے ملیں۔ چھوٹی لڑکی مجھے ہال کمرے میں لے گئی۔ یہاں گل زیب رزی کا جوڑا پہنے بڑی بن سنور کر اپنی سہیلیوں میں بیٹھی ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ گل زیب نے مجھے دیکھا تو اٹھ کر میرے پاس آ گئی۔

"میں نے انتظار تو نہیں کروایا؟"

زیب نے مسکرا کر کہا۔

"یہ تو انتظار کرنے والوں سے پوچھیے۔"

اس پر زیب کی سہیلیاں کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ میں نے زیب کو تحفے کا پیکٹ پکڑا دیا۔ ایک لڑکی بولی۔

"اس میں ترکی ٹوپی تو نہیں۔"

سب لڑکیاں پھر ہنس پڑیں۔ ان میں زیادہ تعداد پنجابی گھرانوں کی لڑکیوں کی تھی۔ کچھ بنگالی اور دو ایک سیلونی لڑکیاں بھی تھیں۔ بہرحال لڑکیاں خواہ کسی صوبے، کسی مذہب سے تعلق رکھتی ہوں لڑکیاں ہی ہوتی ہیں۔ انہیں تو مذاق کے لئے کوئی موقعہ ملنا چاہیئے۔ پھر ان کی شوخی، شرارت اور زندہ دلی کو دیکھئے۔ بہرحال پیکٹ کھول دیا گیا۔ چینی ٹی سیٹ اور بنگلور کا پرس زیب کو بہت پسند آیا۔ ویسے بھی وہاں دو تحفے لے کر کوئی نہیں آیا تھا۔ زیب کی سہیلیوں نے پرس کی بڑی تعریف کی۔ ایک بولی۔

"وصی صاحب بالکل عورتوں کی طرح سوچتے ہیں۔"

سب ہنس پڑیں۔ زیب نے کہا۔

"آپ ایک ہی تحفہ لے آتے۔ دو کی تکلیف کیوں کی؟"

"اگر مجھے علم ہوتا کہ یہاں اتنی خوبصورت لڑکیاں جمع ہوں گی تو میں تحفوں کا ایک ریڑھ بھر کر لے آتا۔"

ایک تیز پنجابی لڑکی بولی۔

"خدا کے لئے آپ ابھی چلے جایئے۔ آپ کا ریڑھ تو باہر کھڑا ہی ہو گا۔"

پھر زوردار قہقہے لگے۔ اس کے بعد زیب نے کیک میں جلتی ہوئی موم بتیوں کو پھونکیں مار کر بجھایا۔ ہر طرف سے تالیوں کا شور سنائی دیا۔ مہمانوں میں چائے اور دوسری مشروبات بانٹی جانے لگیں۔ حاجی صاحب نے مجھے اپنے دوستوں سے متعارف کروایا اور پاس بٹھلا کر چائے وغیرہ پلائی۔ لوگ مجھ سے ریڈیو سیلون کے بارے میں عجیب بے ہنگم قسم کے سوال کرنے لگے۔ میں بہت جلد بور ہو گیا۔ میں دراصل زیب سے ملنے آیا تھا۔ اور اس کے ساتھ اس کی سہیلیوں کی معیت میں وقت گزارنا چاہتا تھا۔ لیکن ایسا ہوتا نظر نہیں آتا تھا۔ چائے کے بعد مہمانوں نے ٹولیاں بنا کر باتیں شروع کر دیں۔ حاجی صاحب بھی کسی کام کو اندر چلے گئے۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور کوٹھی کے باغ میں ٹہلتا ہوا ذرا دُور درختوں کے جھنڈ کی طرف نکل گیا۔ میں لوہے کے جنگلے پر پاؤں ٹکا کر سگریٹ پی رہا تھا۔ اور دوسری طرف کوٹھی کی روشن کھڑکی پر ہوا میں لہراتے ہوئے ریشمی پردے کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک کسی نے عقب سے مجھے آہستہ سے پکارا۔

"میں مخل تو نہیں ہوئی؟"

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ زیب کی ایک سہیلی میرے پیچھے کھڑی تھی۔ میں نے اسے ابھی ابھی گل زیب کے ساتھ دیکھا تھا۔ خوبصورت شکل و صورت کی لڑکی تھی۔ گول چہرہ، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، گورا رنگ، مناسب قد، شلوار قمیض اور دوپٹے میں ملبوس تھی۔ نچلا ہونٹ چوڑا تھا اور آلوچے کی یاد تازہ کر رہا تھا۔ جسم صحت مند تھا اور ٹھسی ہوئی قمیض میں جگہ جگہ سے باہر جھانک رہا تھا۔

"جی نہیں ----- کبھی لڑکی بھی مخل ہوئی ہے بھلا۔"

وہ ذرا سا ہنس پڑی اور کچھ شرما بھی گئی۔

"آپ ریڈیو سیلون پر کام کرتے ہیں نا؟"

"جی ہاں۔"

"میں آپ کا پروگرام بڑے شوق سے سنا کرتی ہوں۔ مجھے آپ کے لکھے ہوئے فیچرز بڑے پسند ہیں۔ اور آپ کی آواز بھی بہت پسند ہے۔"

"شکریہ! یہ میری خوش نصیبی ہے کہ آپ ایسی خوبصورت لڑکی میرے پروگرام اور خاص طور پر میری آواز کو پسند کرتی ہے۔"

Murtaza A. Siddiqui
mazom4u@gmail.com
NOVELS URDU STORIES

لڑکی شرما گئی۔ لیکن ذرا پڑھی لکھی اور ماڈرن ہونے کی وجہ سے وہاں سے نہ ہلی اور مجھ سے بے دھڑک باتیں کرتی رہی۔ میں نے پوچھا۔

"آپ پنجابی ہیں ناں۔"

"جی ہاں۔"

"سبحان اللہ! پنجابی چھروں کو تو یہاں ترس گیا ہوں۔ وطن کونسا ہے؟"

"گوجرانوالہ۔"

"سبحان اللہ! گوجرانوالہ سے کولمبو کیسے آ گئیں آپ؟"

"ابا جان یہاں لکڑی کی ٹھیکیداری کا کام کرتے ہیں۔"

"یعنی آپ کا مطلب ہے جنگل کی ٹھیکیداری کرتے ہیں۔"

"جی ہاں! دراصل میں ان کے کاروبار سے پوری طرح واقف نہیں ہوں۔"

"اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ ویسے ماشاء اللہ جنگل کا آپ پر بھی اثر ہے۔ چہرہ جنگلی گلاب کی طرح کھلا ہوا ہے۔"

اب کے وہ زیادہ شرما گئی۔ دراصل اسے توقع نہیں تھی کہ میں اس سے اتنی بے تکلفی سے باتیں کرنی شروع کر دوں گا۔ اور میں ہر لڑکی سے بے تکلف ہو جانا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ میں نے کہا۔

"میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں۔"

"ثریا۔"

"گوجرانوالہ ٹائپ کا نام ہے۔"

"آپ کو اچھا نہیں لگا۔"

"کیوں نہیں؟ میں تو اس نام کی قسم کھا سکتا ہوں۔"

لڑکی منہ دوسری طرف کر کے دیکھنے لگی۔ اس کے کپڑوں سے ایوننگ ان پیرس کی خوشبو آ رہی تھی۔ میری طرف آ کر بولی۔

"کیا آپ کی بیگم بھی آپ کے ساتھ ہی کولمبو میں ہے؟"

میں ہنس پڑا۔

"ابھی بچہ ہوں۔ بیگم کا دُور دُور تک نشان نہیں۔ بوریلا جنکشن والے چوک میں ایک

کوٹھی ہے اولمس پیلس۔ اس کے ایک کمرے میں اکیلا رہتا ہوں۔"

ثریا کے چہرے پر خوشی کی چمک سی آ گئی۔ اس نے مُسکرا کر کہا۔

"آپ بڑی ہنسانے والی باتیں کرتے ہیں۔"

"وچی میں تو ہنسا ہنسا کر پیٹ کے سب بل نکال دیا کرتا ہوں۔"

"میں نے کئی دفعہ سوچا تھا کہ آپ کو خط لکھوں یا فون کروں۔ لیکن پھر یہ سوچ کر نہ کرتی کہ کہیں آپ کچھ اور نہ سمجھ بیٹھیں۔"

مجھے ثریا کی یہ بات کھٹکی۔

"اور کیا نہ سمجھ بیٹھوں؟"

"یہی کہ ------ کہ -----"

وہ لڑکی خاموش ہو کر کھسیانی سی ہو کر ہنس دی اور میری شہ پر کہنے لگی۔

"دراصل ہم لڑکیاں غیر مرد کو خط لکھتے ہوئے ہمیشہ ڈرا کرتی ہیں۔"

"لیکن مجھے خط لکھتے ہوئے کسی لڑکی کو نہیں ڈرنا چاہیئے۔ میں تو صبح کی ہوا ہوں جو پھولوں کا منہ چوم کر آگے گزر جاتی ہے۔"

ثریا کا منہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ اس نے منہ پرلی طرف کر لیا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے تیز ہوا میں گلاب کی ٹہنی ایک طرف کو جھک گئی ہو۔ مجھے اس لڑکی کا گول گول چہرہ، سیاہ بڑی بڑی آنکھیں اور آلو چے ایسا نچلا ہونٹ بڑا اچھا لگا تھا۔ دل نے کہا اس حسینہ سے بھی اگر عشق ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ آخر پردیس میں دن بھی تو گذارنے ہوئے۔ اور پھر لڑکی بھی صحت مند اور خوش شکل تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ پنجابی تھی۔ یعنی گوجرانوالہ کی رہنے والی تھی۔ جہاں کے خربوزے اور کیپڑ بڑا مشہور ہے۔ عشق کرنے کا مزا تو کچھ اپنی زبان میں ہی آتا ہے۔ اردو بولتے ہوئے تو یوں لگتا ہے جیسے آدمی جھوٹ بول رہا ہو۔ میں نے پوچھا۔

"آپ کی رہائش کہاں ہے؟"

"پٹیہ میں۔"

بہت خوب۔ ان لوگوں نے کولمبو میں بھی گوجرانوالے کو نہیں بھلایا۔ یہاں بھی ایسا محلہ تلاش کیا جو گوجرانوالے کے نانک پورے سے ملتا جلتا ہے۔ پٹیہ میں مسلمانوں کی کافی آبادی تھی اور دو منزلہ مکانات گلی در گلی چلے گئے تھے۔ ثریا بولی۔

Murtaza A. Siddiqui
mascom4u@gmail.com
NOVELS URDU STORIES

"اگر میں ریڈیو سیلون دیکھنے آؤں تو مجھے اجازت مل جائے گی۔"

"آپ جس روز آنا چاہیں مجھے فون کر لیں اور پھر بے شک چلی آئیں۔ آخر ہم وہاں کس لئے بیٹھے ہیں؟"

ثریا بڑی خوش ہو گئی۔

"تو پھر میں آپ کو فون کر لوں گی۔ میرے ساتھ دو ایک سہیلیاں بھی ہوں گی۔ کیا ان کے لئے بھی اجازت لینی پڑے گی؟"

میرا مزہ کرکرا ہو گیا۔

"یہ سہیلیاں کیوں ہر لڑکی کے ساتھ لگی رہتی ہیں؟ آپ اکیلی ہی آئیں تو زیادہ مناسب ہو گا۔"

ثریا نے مسکرا کر کہا۔

"میں اکیلی ہی آجاؤں گی۔"

اتنے میں وہاں گل زیب بھی آ گئی۔

"ارے واہ! یہ آپ میری سہیلی کو الگ لئے کیا باتیں کر رہے ہیں؟"

میں نے ہنس کر کہا۔

"تمہارے خلاف باتیں ہو رہی تھیں۔ ثریا کہہ رہی تھی کہ زیب نے چائے ٹھنڈی پلائی ہے۔"

"ارے واہ! آپ گرم چائے منگوا لیتے۔ کہیں آپ رومانٹک تو نہیں ہو رہے وصی صاحب؟"

میں نے سگریٹ جلا کر کہا۔

"اتنی خوبصورت رات میں جبکہ آپ ایسی لڑکیاں پاس ہوں تو میں کیا ایک ریچھ بھی رومانٹک ہونے پر مجبور ہو جائے گا۔"

زیب اور ثریا قہقہہ لگا کر ہنس پڑیں۔ ثریا اور زیب خدا حافظ کہہ کر اندر چلی گئیں۔ میں کچھ دیر حاجی جبار اور انجم صاحب کے پاس بیٹھا ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ پھر میں نے اجازت لی اور ٹیکسی میں سوار ہو کر گھر آ گیا۔

کوٹھی آیا تو اولمپس پیلس والوں کی محفل جمی ہوئی تھی۔ کوٹھی کی چار دیواری کے اندر

لان میں ایک طرف میز لگی تھی اور شراب اڑ رہی تھی۔ مسز جونس، مسٹر جونس، سامنے والی بطخ نما لڑکی اور کانا عاشق بیٹھے تھے اور شراب کا دور چل رہا تھا۔ شراب دیسی تھی اور بڑی ناپ تول کر پی جا رہی تھی۔ جب میں ٹیکسی میں سے دو گلاسوں میں تھوڑی تھوڑی شراب ڈال کر انہیں ایک آنکھ سے سامنے کر کے دیکھ رہا تھا کہ کسی میں زیادہ شراب تو نہیں پڑ گئی۔ مجھے دیکھ کر مسز جونس نے خوشی کا ایک نعرہ بلند کیا۔ کرسی پر سے اٹھی اور میرا منہ چوم لیا۔

"میرا پیارا بیٹا آ گیا۔ اب مجھے کسی شے کی ضرورت نہیں۔ اب میں جو چاہوں گی مجھے مل جائے گا۔ کیوں میرے پیارے! تمہاری الماری میں میری پسندیدہ شراب تو ضرور ہو گی؟ یہ لوگ تو کنجوس مکھی چوس ہیں۔ دیکھو تو یہ شخص کس طرح بنئے کی طرح ناپ تول کر رہا ہے؟"

میں نے مسکرا کر مسز جونس کا ہاتھ دبایا اور بازو تھپتھپا کر کہا۔

"تمہیں شراب پلا کر مجھے خوشی ہو گی مسز جونس۔"

مسٹر جونس نے قہقہہ مار کر کہا:

"اور کیا ہم تمہارے کچھ نہیں لگتے مسٹر وصی؟"

میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا:

"مسز جونس کا ہر رشتے دار میرا پیارا ہے۔"

مسز جونس تو خوشی سے مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے بمشکل اس سے اپنا آپ چھڑایا۔ کیونکہ مسز جونس کے موٹے بدن سے باسی ناریل کی بُو آ رہی تھی۔ کمرہ کھول کر میں نے الماری میں سے وائٹ 69 کی پوری بوتل اور سینئر سروس سگریٹ کے چار بڑے پیکٹ نکالے اور باہر لان میں آ گیا۔ مسز جونس کی باچھیں کھل گئیں۔ اس نے ایک ہاتھ میں سگریٹ اور دوسرے ہاتھ میں بوتل لی اور اس کا ڈھکنا دانت سے کھول کر اپنے گلاس میں انڈیلنے لگی۔ کانا عاشق بھی بڑا خوش تھا۔ اس نے ایرق کی دیسی شراب کی بوتل میں کارک لگا کر اسے میرے پیچھے رکھ دیا اور اپنا گلاس خالی کر کے مسز جونس کے آگے رکھ دیا۔

"اب میں تمہیں بھی بنیے کی طرح ناپ تول کر دوں گی۔"

کانے عاشق کی آنکھ پھڑکنے لگی۔ وہ دو پیگ حلق میں انڈیل چکا تھا۔ مگر اس پر ذرا بھی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس کی محبوبہ نے صرف نصف پیگ ہی لیا تھا۔ مسز جونس نے اس لڑکی کو

NOVELS URDU STORIES
Murtaza A. Siddiqui
mascom4u@gmail.com

بھی ایک پیگ بنا کر دیا۔ وہ بھاگ کر اندر سے میرے لئے بھی ایک گلاس لے آئی۔ واٹ 69 کا دور شروع ہو گیا۔ کانا عاشق بغیر آواز کے شراب حلق میں ڈالتا اور چپکے سے خالی گلاس مسز جونس کے آگے سرکا کر خود سر جھکا کر چپکا ہو رہتا اور اپنی اکلوتی آنکھ سے اپنے گلاس کو دیکھتا رہتا۔ مسز جونس ساقی گری کا فرض انجام دے رہی تھی۔ اس کے باوجود سب سے زیادہ شراب کانے عاشق نے ہی پی اور سب سے کم نشہ اسی کو ہوا۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد بوتل خالی ہو گئی۔ مسز جونس نے لجاجت سے میری طرف دیکھا۔ میں اندر جا کر کچھ بیئر کی بوتلیں اٹھا کر لے آیا۔ اب بیئر کا دور شروع ہو گیا۔ مسز جونس نے مسالے دار آلو بنا رکھے تھے۔ انہوں نے بڑا مزہ دیا۔ رات کے گیارہ بجے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ کانے کی محبوبہ نے تیسرے پیگ کے بعد ہاتھ کھینچ لیا تھا اور آرام کرسی کی پشت سے سر لگا کر آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی۔ کسی وقت گھبرا کر آنکھیں کھول دیتی۔ اپنے کانے عاشق کا ہاتھ دباتی۔ اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتی اور پھر سر پیچھے لگا کر آنکھیں بند کر دیتی۔ مسٹر جونس نے حسب معمول صرف خاکی نیکر ہی پہن رکھی تھی۔ وہ بڑی گرمجوشی سے باتیں کر رہا تھا اور بات بات پر قہقہے لگا رہا تھا۔ اس کی بیوی یعنی مسز جونس کا بھی تقریباً یہی عالم تھا۔ وہ اپنے خاوند کے منع کرنے کے باوجود اندر جا کر اپنے دونوں بچوں کو جگا کر انہیں جیب میں سے سینٹ کے سکے دے آئی تھی۔ اور اب بار بار ان ہی کا ذکر کر رہی تھی۔

کانا عاشق کافی شراب پی چکنے کے بعد اب بیئر کا دوسرا گلاس خالی کر رہا تھا۔ اسے نشہ چڑھ گیا تھا اور وہ حسب عادت اپنی گردن طوطے کی طرح دائیں بائیں ہلا رہا تھا۔ مسٹر جونس بار بار سینے اور کندھے پر ہاتھ مار کر مچھر مار رہا تھا۔ میں بھی نشے میں تھا۔ میں بیٹھا تو ان لوگوں میں تھا لیکن ذہن میں ایلورا کا دلکش سانولا سانولا قدیم ہندی چہرہ اور اس کی باتیں گونج رہی تھیں۔ اچانک مسٹر جونس نے اپنے کھانے کا نعرہ لگایا۔ سبھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور گرتے گرتے بچے۔ کانا عاشق اپنی بطخ ایسی محبوبہ کو ہاتھ سے پکڑ کر اٹھایا اور خود لڑکھڑا گیا۔ اس کی محبوبہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ سب لوگ اندر چلے گئے اور میں سگریٹ سلگا کر کوٹھی سے باہر نکل آیا۔ میرا دل ایلورا کی یاد میں بے قرار تھا۔ میرے قدم بے اختیار ایلورا کے گھر کی طرف اٹھنے لگے۔ بوریلا چوک میں صرف چند ایک ریستوران کھلے تھے۔ عمارتوں میں کہیں کہیں خواب گاہوں میں روشنی ہو رہی تھی۔ رات بڑی پُرسکون، خنک اور مرطوب تھی۔ سمندر

کی طرف سے بڑی خوشگوار ہوا چل رہی تھی جس میں ناریل کے درختوں اور انناس کی خوشبو تھی۔ جنوب مشرقی ایشیا کا سبز آسمان ستاروں سے بھرا ہوا تھا۔ سڑکیں خالی خالی تھیں۔ اکا دکا لوگ ادھر اُدھر جا رہے تھے۔

ٹھنڈی ہوا لگنے سے میرا نشہ دوچند ہو گیا۔ دو ایک بار میرے قدم لڑکھڑا گئے۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو سنبھالے رکھا۔ کیونکہ میں مقدس ایلورا کے کوچے میں جا رہا تھا۔ اپنے محبوب کی گلی میں جا رہا تھا۔ میں ٹمپل روڈ کے فٹ پاتھ پر چوک والے بدھی مندر کی سمت چلا جا رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس وقت ایلورا سے ملنا محال ہے۔ پھر بھی کوئی غیبی طاقت تھی جو مجھے کشاں کشاں اس کے گھر کی طرف لئے جا رہی تھی۔ مسز جونس اور مسٹر جونس کا گھرانہ اچھے مخلص قسم کے لوگوں کا تھا۔ مگر میں ان میں بے تکلف ہو کر بھی ایک قسم کی اجنبیت محسوس کرتا تھا۔ ایلورا کے گھر کی طرف جاتے ہوئے میں محسوس کر رہا تھا جیسے میں اپنے گھر کی طرف جا رہا ہوں۔ اپنے لوگوں سے ملنے جا رہا ہوں۔ حالانکہ ایلورا میری زبان سے ناواقف تھی۔ ہم کبھی انگریزی اور کبھی ہندوستانی میں بات کیا کرتے تھے۔ ایلورا مدارس کی رہنے والی تھی۔ جس کا باپ سیلون میں آ کر آباد ہو گیا تھا۔ لیکن ہم دونوں ہندی تھے۔ ایک ہی مٹی سے ہمارا خمیر اٹھا تھا۔ ایک ہی باغ میں چلنے والی ہوا کے جھونکے تھے۔ ایک ہی شعلے سے ٹوٹے ہوئے شرارے تھے اور ایک ہی چشمے سے نکلی دو ندیاں تھیں۔

اب ایلورا کا گھر قریب آ رہا تھا۔ مجھے ہوا میں ایلورا کے بالوں کی مہک اور اس کے ہونٹوں سے اُٹھتی ہوئی خوشبو محسوس ہونے لگی تھی۔ میں سامنے والے فٹ پاتھ پر ہو گیا۔ اتفاق سے ایلورا کے گھر کے سامنے والا ریستوران کھلا تھا۔ میں سڑھیاں چڑھ کر ریستوران کے چبوترے کے پاس بچھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا اور کافی منگوا کر پینے لگا۔ ایلورا کے مکان کا لکڑی کا دروازہ بند تھا۔ برآمدے میں اندھیرا تھا۔ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ یہ روشنی روشندان میں سے باہر چھن رہی تھی۔ دروازہ بند تھا بند دروازے کے شیشے کے آگے سُرخ پردہ گرا ہوا تھا۔ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مگر میں سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ایلورا مکان کی دوسری جانب صحن میں چارپائی پر سو رہی ہے۔ اس کا ایک بازو رخسار کے نیچے ہے اور دوسرا سینے کے قریب سمٹا ہوا ہے۔ اس کی جادوگر آنکھیں بند ہیں اور ہونٹ ذرا سے کھلے ہیں۔ اس کے سفید سفید موتیوں ایسے دانتوں کی ایک جھلک

Murtaza A. Siddiqui murtaza4u@gmail.com NOVELS URDU

دکھائی دے رہی ہے۔ لطیف تنفس سے اس کا سینہ آہستہ آہستہ اوپر نیچے ہو رہا ہے۔ سیاہ بال کھلے ہیں اور موتیے کے دودھیا پھول دب گئے ہیں۔ رات کے سبز آسمان پر چمکنے والے سیلونی ستارے اسے ٹکٹکی لگا کر سوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔

میرا دل چاہا کہ میں اُٹھ کر اس کے گھر میں چلا جاؤں اور ایلورا پر جھک کر اس کے نیم وا ہونٹ چوم لوں اور اس کے سیاہ بالوں میں لگا ہوا موتیا آنکھوں سے لگا لوں۔ ایلورا مجھ سے دس قدموں کے فاصلے پر سو رہی تھی۔ لیکن ہم دونوں میں ہزاروں میل کا فاصلہ حائل تھا۔ کروڑوں میل کی مسافت درمیان میں تھی۔ سات سمندر راستے میں پڑتے تھے۔ دھوپ میں تپتے ہوئے بے شمار صحرا خاک اڑا رہے تھے۔ میں ایلورا سے کیسے مل سکتا تھا؟ ایلورا مجھ سے کیسے مل سکتی تھی۔ وہ سو رہی تھی اور خواب میں مجھ سے ملنے ٹاور والے پل کی طرف چلی جا رہی تھی۔ کل صبح دو بجے وہ مجھ سے ملنے آ رہی تھی۔ لیکن ہر ملاقات جدائی کی خبر سنا کر ختم ہو جاتی تھی۔ ہر ملاپ وصل کا پیش خیمہ تھا۔ شہد کے ہر گھونٹ میں بڑھتی ہوئی تلخی کی آمیزش تھی۔ اتنے میں کمرے کی بتی بجھ گئی تھی اور وہاں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ اب میرے لئے وہاں بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ میں نے بل ادا کیا اور بڑی احتیاط سے سیڑھیاں اُترنے لگا۔ اس خیال سے کہ کہیں ہوٹل والے مدارسی کو مجھ پر شرابی ہونے کا شبہ نہ ہو۔ لیکن وہ کمینہ میری ضرورت سے زیادہ احتیاط کو بھی مشکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ریستوران سے نکل کر چوک والے مندر کی طرف چل پڑا۔ مندر کا دروازہ بند تھا۔ سیڑھیوں پر کوئی پھول بیچنے والی نہیں تھی۔ مندر کے اندر روشنی ہو رہی تھی۔ سیڑھیوں پر کہیں کوئی مسلا ہوا کنول کا پھول پڑا تھا۔ میں سگریٹ جلا کر کتنی ہی دیر وہاں کھڑا مندر کی ویران سیڑھیوں کو دیکھتا رہا۔ پھر وہاں سے واپس ہوا۔ فٹ پاتھ پر واپس گھر آتے ہوئے میں ایلورا کے مکان کے آگے سے گذرنے لگا تو قدم اپنے آپ ہی رک گئے۔ میں نے بند دروازے اور جنگلے کو ہاتھ سے چھوا۔ اپنی پیشانی بڑی عقیدت سے دروازے کے پٹ سے لگائی۔ دل ہی دل میں ایلورا کو شب بخیر کہا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے اپنا آپ یوں ہلکا پھلکا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی خزاں زدہ درخت سے ٹوٹ کر گرا ہوا زرد پتا ہوں اور کولمبو کی ہوا مجھے اڑائے لیے پھر رہی ہے۔

7

اپنے کمرے میں آ کر پلنگ پر گرتے ہی سو گیا۔

صبح دیر سے اٹھا۔ سر درد کر رہا تھا۔ یہ رات کوسکاچ میں دیسی بیسر ملا کر پینے کا اثر تھا۔ گھڑی دیکھی تو ساڑھے سات بج رہے تھے۔ ریڈیو پروگرام کے شروع کرنے میں صرف آدھ گھنٹہ باقی تھا۔ جلدی جلدی شیو کی، نہایا اور کپڑے پہن ٹیکسی لے کر دفتر آ گیا۔ جس وقت میں ریکارڈ اور خبریں لے کر سٹوڈیو میں داخل ہو رہا تھا ہندوستانی ٹرانسمیشن میں صرف دو منٹ رہ گئے تھے۔ پورے ایک بجے گھر واپس آیا۔ کپڑے بدلے۔ کچھ روپے جیب میں ڈالے۔ تھوڑا بہت کھانا کھایا اور ایلورا سے ملنے بس میں بیٹھ کر ٹاور برج کی طرف چل پڑا۔ سیرا دل خوشی سے ناچ رہا تھا۔ آج ایلورا مجھے ٹمپل روڈ سے باہر کولمبو کے کھلے اور پُرفضا ماحول میں مل رہی تھی۔ بدھی مندر کی مذہبی اور قدیم فضا میں پریم کی باتیں کرنے والی پُراسرار لڑکی کو آج میں سمندر کے کنارے سیلون کی روشن دُھوپ میں جدید عمارتوں کے درمیان دیکھوں گا۔ کیا وہ مجھے اجنبی سی نہیں لگے گی؟ ایلورا جدید دنیا کی باشندہ نہیں لگتی۔ وہ اس ماڈرن ماحول میں ناموزوں ہے۔

بس نے مجھے ٹاور برج کے شروع میں ہی اُتار دیا۔ میں نے گھڑی دیکھی ایک بج کر پنتیس منٹ ہو رہے تھے۔ ایلورا کے درشنوں میں ابھی پورے پچیس منٹ باقی تھے۔ دُھوپ خوب نکلی ہوئی تھی اور موسم گرم تھا۔ اگرچہ ہَوا ٹھنڈی تھی اور سمندر کی طرف سے اس کے تیز جھونکے یہاں وہاں کھڑے تاڑ کے درختوں کو جھولا جھلا رہے تھے۔ شہر کے اس ماڈرن علاقے میں لوگوں، بسوں اور موٹروں کی بڑی ریل پیل تھی۔ زرد اور نیلے رنگ کی دو سنزلہ بسیں بڑے وقار سے گذر رہی تھیں۔ پُل کے نیچے لائنیں بچھی تھیں۔ ایک سبز رنگ کے ڈبوں والی لوکل ٹرین تیزی سے گذر گئی۔ ایک انیگلو سیلونی خوبصورت لڑکی چھتری لگائے میرے قریب سے گذرنے لگی تو اس نے ایک پل کے لئے مجھے دیکھا اور پھر نظریں موڑ کر چلتی بنی۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور آہستہ آہستہ فٹ پاتھ پر بڑے مزے سے چلتا مارکیٹ کی طرف آ گیا۔ یہ مارکیٹ سہ منزلہ عمارت میں بنی ہوئی تھی اور اس کی ہر منزل میں ------

Mujtaza A. Siddiqui
mascom4u@gmail.com
NOVELS UPDATE STORIES

الگ الگ اشیا کا سٹور تھا۔ پہلی منزل میں منیاری کا سامان اور دوسری منزل میں کپڑا اور تیسری منزل میں چمڑے کا سامان بکتا تھا۔ یہ کولمبو کی سب سے بڑی مارکیٹ تھی اور یہاں روزانہ ہزاروں کی بکری ہوتی تھی۔ میں نے ایک بنگالی کی دکان پر سے پان کھایا۔ کچھ دیر مارکیٹ کی پہلی منزل میں گھوم پھر کر چیزیں دیکھیں اور پھر باہر چھتی ہوئی ڈیوڑھی کے ایک ستون کے پاس جا کھڑا ہو گیا۔

یہاں سے مجھے بازار دور تک صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میری آنکھیں اس بس سٹاپ پر لگی تھیں۔ جہاں ٹمپل روڈ والی بس آ کر کھڑی ہوتی تھی۔ جب دو بج کر پانچ منٹ اوپر ہو گئے تو میں بے چین ہو کر ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ کہیں ایلورا کو کوئی کام تو نہیں پڑ گیا؟ ایسا ہو سکتا تھا۔ لیکن دل کہتا تھا کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ ایلورا اب کام چھوڑ کر مجھ سے ملنے ضرور آئے گی۔ وہ مجھ سے جھوٹا وعدہ نہیں کر سکتی۔ وہ ضرور آئے گی۔ بس اب آ رہی ہو گی۔ آ رہی ہو گی۔ اس کی بس اب میونسپل گارڈن کے سامنے سے گذر رہی ہو گی۔ اب وہ بملا پٹی کے چوک سے گذری ہو گی۔ اچانک میں نے دیکھا کہ ایک لڑکی ہلکے پیازی رنگ کی ساڑھی پہنے، ماتھے پر تلک لگائے فٹ پاتھ پر چلی آ رہی ہے۔ یہ ایلورا تھی۔ تیز ہوا میں اس کی

ساڑھی کا ایک پلو اڑ رہا تھا۔ جسے وہ بار بار سنبھال رہی تھی۔ اس نے بھی دور سے مجھے دیکھ لیا تھا۔ ہماری آنکھیں چار ہوئیں۔ وہ ذرا سی مسکرا دی۔ قریب آ کر اس نے ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا۔ میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ پیازی ساڑھی میں ماتھے پر سرخ تلک لگائے وہ پہلے سے زیادہ دلکش معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے بالوں کو کس کر پیچھے ان کا جوڑا بنا رکھا تھا۔ اس طرح اس کا ماتھا پہلے سے زیادہ فراخ ہو گیا تھا۔ چہرہ گول نکل آیا تھا۔ جوڑے میں موتیے کا ایک ہار لپیٹ رکھا تھا۔ کانوں میں سبز پتھر تھے۔ ناک میں کچھ نہیں تھا۔ پاؤں میں چپل اور کلائی میں سرخ رنگ کی چوڑیاں تھیں۔ گہرا سانولا رنگ دھوپ میں تمتما رہا تھا۔ اس کے کپڑوں سے خاکی گرم خوشبو آ رہی تھی۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر اس کے سلام کا جواب دیا۔ اور ہم چھتے ہوئے فٹ پاتھ پر سمندر کی طرف جانے والی سڑک کی طرف چل پڑے۔

"میں تمہیں بس سٹاپ پر دیکھ رہا تھا ایلورا۔"

"میں بس میں نہیں آئی۔ میں اپنی ایک سہیلی کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ وہاں سے پیدل آ رہی ہوں۔ اس کا گھر یہاں سے قریب ہی ہے۔ وہ تار گھر میں ملازم ہے۔"

"تمہیں گھر والوں نے باہر نکلنے کی اجازت کیسے دی؟"

ایلورا نے مسکرا کر کہا۔

"مجھے گھر والوں نے باہر جانے سے روکا کب ہے؟ وہ تو میں خود کبھی کسی جگہ نہیں جاتی۔ میرے ماتا پتا جی کو مجھ پر بڑا بھروسا ہے۔"

ہم نے فٹ پاتھ چھوڑ کر ایک کشادہ چوک عبور کر لیا۔ دوسری بڑی سڑک کے فٹ پاتھ پر آ کر پھر ایک چوک میں سے گذرے۔ اب سامنے وہ سڑک تھی۔ جس کے عقب میں خلیج بنگال اور بحیرہ عرب کے سمندروں کا ملا جلا گہرا نیلا پانی سمندر کی بڑی بڑی موجوں کو ساحل کی طرف بھیج کر واپس بلا رہا تھا۔ اب ہوا تیز ہو گئی تھی۔ کیونکہ ادھر ادھر سر بفلک گنجان عمارتوں کی روک کہیں نہیں تھی۔ سمندر کے کنارے ذرا نیچے اتر کر ناریل اور تاڑ کے درختوں کے جھنڈوں کے جھنڈ شروع ہو جاتے۔ جو ساحل کے ساتھ ساتھ ماؤنٹ لیونیا بیچ تک چلے گئے تھے۔ یہاں ایک بڑا خوبصورت کاٹج نما ریستوران تھا جس کی میزیں ناریل کے درختوں کے بیچ بیچ میں بچھی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں اس ریستوران میں آ گئے اور ایک جگہ ناریل کے جھنڈ میں گھری ہوئی میز کے پاس بانس کی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سمندر ہم سے کوئی پچاس گز کے فاصلے پر تھا۔ دھوپ میں اس کی لہریں چمک رہی تھیں۔ یہ لہریں درختوں کے تنوں کے درمیان سے ساحل کی ریت کا منہ دھلاتی صاف نظر آ رہی تھیں۔ ہوا خوب چل رہی تھی۔ یہ ہوا مرطوب تھی اور اس میں مچھلی کی بو تھی۔

ایلورا نے ساڑھی کو خوب اچھی طرح جسم کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ پھر بھی تیز ہوا اس کا ایک پلو اڑا رہی تھی۔ ماتھے پر آیا ہوا بالوں کا چھلا لہرا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں معمول سے زیادہ شفاف اور چمکیلی تھیں۔ چہرے کا رنگ دمک رہا تھا۔ بھرے بھرے ہونٹوں پر شہد کا رس چمک رہا تھا۔ ہم کافی پینے لگے۔ ایلورا کبھی کبھی مجھے دیکھ لیتی اور پھر ناریل کے درختوں میں سے نظر آنے والے چمکیلے سمندر پر نظریں گاڑ دیتی۔ وہ اس جدید دنیا اور دن کے اجالے میں بھی راتوں کے کسی پرانے اور قدیم مندر کی دیوداسی سی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ بڑی گہری اور پراسرار آواز میں حسب عادت سرگوشیوں کے سے انداز میں باتیں کر رہی تھی۔ باتیں کرتے ہوئے اس کی زبان سے ایک ہلکی سی سسکار پیدا ہو رہی تھی۔ جسے سن کر مجھے اس سیاہ ناگ کا خیال آ جاتا تھا جو جھڑے ہوئے خشک پتوں پر سے گزر رہا ہو۔

Murtaza A. Siddiqui
mascom4u@gmail.com
NOVELS UPLOADED BY WWW.PAKSOCIETY.COM

میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"تمہیں جلدی تو واپس نہیں جانا ایلورا؟"

ایلورا نے سمندر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں شام تک سہیلی کے ہاں رہ سکتی ہوں۔"

میں خاموش ہو گیا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ آج ایلورا شام تک میرے ساتھ ہو گی۔ دراصل میں نے پروگرام ہی یہ بنایا تھا کہ تین بجے تک ریستوران میں بیٹھ کر کافی پئیں گے۔ سمندر کی سیر کریں گے اور اس کے بعد سینما دیکھنے کسی سینما ہال میں گھس جائیں گے۔

میں ایلورا کے ساتھ تنہائی میں بیٹھ کر اس کے ہونٹوں، رخساروں، ہاتھوں، بازوؤں بلکہ سارے جسم کو جی بھر کر پیار کرنا چاہتا تھا۔ جب میں نے ایلورا سے سینما کا ذکر کیا تو اس نے سمندر کی طرف بدستور تکتے ہوئے کہا۔

"جیسے تمہاری مرضی۔"

ایلورا کو صرف میری خوشی اور خوشنودی منظور تھی۔ میں اس کے اس جذبے سے بے حد متاثر ہوا۔ میں نے سگریٹ کا کش لے کر کہا۔

"لیکن تم سمندر کی جانب کیا دیکھ رہی ہو؟"

ایلورا میری طرف دیکھ کر ذرا سی مسکرائی اور کہنے لگی۔

"مجھے اپنے دیس کا ایک لوک گیت یاد آرہا ہے۔"

"تمہیں یاد ہے؟"

"ہاں"۔

"گا کر سناؤ گی؟"

"سنا سکتی ہوں مگر یہاں نہیں۔ میں تمہیں ترجمہ سناتی ہوں۔"

اس کے بعد اس نے ایک گہرا سانس لیا اور میری طرف دیکھ کر خشک آواز میں بولی۔

"یہ گیت ایک ہرنی کی فریاد ہے۔ حقیقت میں اس میں ہندوستان کی ہر عورت کی بپتا اور دکھ درد سمویا ہوا ہے۔"

اب اس نے اپنے دیس کے لوک گیت کا ترجمہ کر کے سنایا جو یہ تھا۔

"--------- کس طرف سے ہرنی آئی؟ وہ آم کے پیڑ تلے کھڑی ہے۔ پورب کی طرف سے ہرنی آئی۔ وہ آم کے پیڑ تلے کھڑی ہے۔ کس طرف سے شکاری آیا؟ اُس نے ہرنی کو تیر مارا۔ پچھم کی طرف سے شکاری آیا۔ اُس نے ہرنی کے تیر مارا۔ شکاری نے ہرنی کے دم پر تیر مارا۔ ہرنی بھاگ گئی۔ ہائے اسے کتنا دکھ ہوا۔

------ ہرن کے بغیر ہرنی تنہا ہے۔ اس جنگل میں ہرن ہرنی کو تنہا چھوڑ گیا۔ ہرنی ہرن کی تلاش میں ہے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے سارا جنگل چھان مارا۔ ہرن کے بغیر ہرنی تنہا ہے۔ اس جنگل میں ہرن ہرنی کو اکیلے چھوڑ گیا---- کہیں نہ وہ ملا، وہ ظالم ہرن۔ بار بار اس نے وہ جنگل چھان مارا۔ ہرن کے بغیر ہرنی اکیلی ہے۔ ہرن اس جنگل میں ہرنی کو اکیلے چھوڑ گیا۔

------- ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہرنی تھک گئی۔ آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ ہرن کے بغیر ہرنی تنہا ہے۔ ہرن اس جنگل میں ہرنی کو اکیلا چھوڑ گیا۔ چکر کھا کر ہرنی گر پڑی۔ یہ دکھ سہا نہیں جاتا۔ ہرن کے بغیر ہرنی اکیلی ہے۔ ہرن اس جنگل میں ہرنی کو اکیلے چھوڑ گیا۔

------- میرے ہرن کو نہ مارنا۔ ہماری قطار سونی ہو جائے گی۔ راجہ ہم ہرنیوں کو مار لے۔ ایک دو۔ چاہے چار----- مجھے مار لے جاؤ۔ ہمارے ہرن کو نہ مارو۔ ہم تو اپنے پیا کے کھیت میں چرتے ہیں۔ ہمارے ہرن کو مت مارو۔ کس سمت کے شکاری ہو؟ کس سمت کو جا رہے ہو؟ آگے کی سمت کے شکاری ہو؟ پورب کی طرف جا رہے ہو؟ ہمارے ہرن کو نہ مارو۔ کس چیز کی کھونٹیاں ہیں؟ کس چیز کی تانتیں ہیں؟ ہمارے ہرن کو نہ مارو۔

------ ارے او شکاری! میری بات سن لے! میری بات مان لے۔ شکاری میری بات مان لے۔ جب شکاری نے پھندہ لگایا۔ ہرنی کود کر بغل میں جا کھڑی ہوئی۔ ہرنی کا پاؤں پھنس گیا۔ رام! ہرنی کا پاؤں پھنس گیا۔ ہرنی کھڑی ہوئی آنسو گرا رہی ہے۔ او ہرن! میری بات سن لے تُو تو اس پھندے میں پھنس گیا۔ میرا کیا حال ہو گا۔

او ہرن میرا کیا حال ہو گا؟

------ ہرن کھڑا ہوا یہ سمجھا رہا ہے۔ ہرنی! میری بات سن لے۔ اس کے گھر کا خرچ بڑھ گیا ہے۔ اس لئے میرا گوشت بیچ کر گزارہ کر لینے دے۔ ہرنی اسے میرا گوشت بیچ

NOVELS URDU STORIES
Murtaza A. Siddiqui
mascom4u@gmail.com

کر گذارہ کر لینے دے۔

--------- اتنی بات سن کر شکاری آگے بڑھا۔ اس نے پھندا کاٹ دیا۔ ہرنی آنسو گرا رہی ہے۔ بھگوان نے پھر سے جوڑی ملا دی جوڑی ملا دی۔ شکاری! پھر سے جوڑی ملا دی۔"

گیت واقعی بڑا دردناک تھا۔ اس لوک گیت میں ایک ہندی عورت کے جذبہ قربانی اور ماستا کی پکار تھی۔ ایلورا خاموش ہو گئی اور اس نے سر کرسی کی پشت سے لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس وقت وہ کوئی عہدِ ماضی کی عورت معلوم ہو رہی تھی۔ یا وہ ہرنی جس کا ہرن جنگل میں اسے اکیلا چھوڑ گیا ہے۔ جس نے جنگل کا کونہ کونہ چھان مارا ہو لیکن ہرن کا کوئی پتہ نہ چلا ہو۔ سمندر کی لہروں کا شور بلند ہو رہا تھا۔ اوپر ناریل کے درختوں کی ٹہنیاں جھول رہی تھیں۔ آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے نکل آئے تھے۔ سورج کبھی بادلوں میں چھپ جاتا اور کبھی باہر نکل آتا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

"ایلورا! کہیں یہ تمہارے ہی زخمی دل کی پکار تو نہیں تھی؟ کیا تمہارا ہرن بھی تمہیں چھوڑ کر جنگل میں کہیں گم ہو گیا ہے؟"

ایلورا نے آنکھیں کھول دیں۔ ان آنکھوں میں غروبِ شام کی روشنی جھلملا رہی تھی۔ کچھ دیر وہ چپ چاپ نگاہوں سے مجھے تکتی رہی۔ پھر ذرا سا مسکرائی اور کہنے لگی۔

"عرصہ ہوا میرا ہرن مجھے سنسان جنگل میں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ میں اس کی تلاش میں کئی صدیوں تک ماری ماری پھرتی رہی۔ میں نے ہندوستان کا کوئی جنگل، کوئی ویرانہ نہ چھوڑا۔ آخر میرا ہرن مجھے مل گیا۔"

"کہاں سے؟"

"کولمبو کی ایک سڑک پر سے۔"

"کولمبو میں؟"

"ہاں کولمبو میں ------ میں ایک روز اپنے مکان کے برآمدے میں کھڑی تھی کہ

(یہ لوک گیت کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر E W COEELL کی لوک گیتوں کی کتاب THE JATAKA سے لیا گیا ہے۔ موصوف نے اس کتاب میں ہندی لوک گیتوں کو مرتب کیا ہے۔)
(مصنف)

اچانک میری نظر اس پر پڑ گئی۔ وہ ٹریم میں بیٹھا کہیں جا رہا تھا۔"

ایلورا پھر سمندر کی طرف دیکھنے لگی۔ میں خاموش ہو گیا۔ کچھ نہ بولا۔ ایلورا نے اپنی زندگی کے سب سے بڑے راز کو چھیڑ دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اس موضوع پر کبھی پوری بات نہیں کرے گی۔ بھولی لڑکی جانے کیوں اور کس طرح یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ میں کہیں اُسے پہلے جنم میں بھی ملا ہوں۔ کہاں ملا ہوں؟ کس روپ میں ملا ہوں؟ یہ باتیں وہ مجھے کبھی نہیں بتاتی تھی۔ میں نے کئی بار پوچھنے کی کوشش کی مگر اس نے ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال دیا کہ مجھے ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہیئے آج جب اس نے خود اس موضوع پر بات شروع کر دی تو میں نے پوچھا۔

"ایلورا! خدا کے لیے مجھے بتاؤ۔ آخر یہ کیا راز ہے؟ کیا تمہیں یقین ہے کہ میں پہلے بھی تمہیں کسی جنم میں مل چکا ہوں؟"

ایلورا نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"اگر یقین نہ ہوتا تو میں ٹریم میں تمہیں پاگلوں کی طرح دیکھتی کیوں چلی جاتی؟ تم نے تو میری سینکڑوں سالوں کی نیند کو توڑ دیا۔ مجھے تمہارا پچھلے جنم کا روپ اسی طرح یاد ہے جس طرح تم اس وقت آج کے روپ میں میرے سامنے بیٹھے ہو؟ کیا تمہیں کچھ بھی یاد نہیں؟"

میں نے سگریٹ کی راکھ جھاڑ کر کہا۔

"کم از کم مجھے تو کچھ یاد نہیں پڑتا۔ میرا تو خیال ہے کہ میں نے زندگی میں پہلی بار تمہیں دیکھا ہے۔ اگر پہلے بھی کہیں دیکھا ہوتا تو میں کیسے بھول سکتا تھا؟"

ایلورا نے ٹھنڈا سانس بھر کہا۔

"یہ تمہارا وہم ہے۔ آہ! تم اتنی جلدی بھول گئے؟ میں نہ جانتی تھی۔

جب میں تمہیں ایک ایک بات یاد دلا دوں گی تو تمہیں سب کچھ یاد آ جائے گا۔"

میں نے آہستہ سے کہا۔

"مجھے یاد دلاؤ ایلورا بتاؤ میں پہلے جنم میں کیا تھا؟ کہاں تھا؟ تم سے میرا کیا رشتہ تھا۔ کیا رشتہ تھا ایلورا؟"

ایلورا نے گھبرا کر سر کو جھٹک دیا۔ وہ کرسی پر سے اُٹھی سمندر کی طرف دیکھ کر ایک آہ بھری اور مسکرا کر بولی۔

NOVELS URDU STORIES
Murtaza A. Siddiqui
mascom4u@gmail.com

"سینما کا وقت ہو رہا ہے۔"

میں اس سے آگے کوئی بات نہ کر سکا۔ میں نے سگریٹ کیس اٹھا کر جیب میں رکھا۔ بل ادا کیا اور ایلورا کو ساتھ لے کر سڑک پر آ گیا۔ اب آسمان پر بادل چھا گئے تھے۔ دھوپ غائب ہو گئی تھی۔ اور ہوا بھی بند ہو گئی تھی۔ یہ بارش کی نشانیاں تھیں چوک میں آ کر ہم نے ٹیکسی لی اور میٹرو سینما کی طرف چل پڑے۔

کوئی انگریزی فلم لگی تھی۔ یہ سینما گال روڈ پر واقع تھا اور اس کا اگلا رُخ سمندر کی طرف تھا جدھر ناریلوں کے جھنڈ بند ہوا میں دم سادھے کھڑے تھے۔ میں ٹکٹ لے رہا تھا کہ بارش ہونے لگی۔ بننہ ایک دم زور سے شروع ہوا اور بڑی زبردست آواز کے ساتھ۔ یوں لگا جیسے سامنے سے کوئی ٹرک آیا اور سینما کی عمارت کے اوپر سے گذر گیا۔ باہر کھڑے لوگ بھاگ کر سینما کی لابی میں آ گئے۔ میں اور ایلورا اوپر کیبن میں آ کر بیٹھ گئے۔ سینما ہال کی ڈھلوان چھت پر بارش نے شور مچا رکھا تھا۔ اندر کان پڑی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ ایلورا نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا اور چپ چاپ بیٹھی تھی۔ اس کا ہاتھ گرم تھا اور کیبن کے پنکھے کی تیز ہوا میں اُس کے ماتھے پر بالوں کی ایک لٹ اڑ رہی تھی۔ اس کے جوڑے میں لگے پھولوں کی میٹھی خوشبو اُس کے بالوں کے خوشبودار تیل کی مہک میں مخلوط ہو رہی تھی اور مجھے اُن قدیم مندروں کا خیال آ رہا تھا۔ جہاں چاندنی راتوں کی پراسرار فضا میں لوبان اور عود کے دھوئیں میں آگ روشن ہو اور کسی مقدس دیوداسی کی شادی ہو رہی ہو۔ پھول اور تیل کی ملی جلی خوشبو نے دیومالائی فضا پیدا کر دی تھی لیکن اس میں ایک قسم کی جنسی کشش اور بلاوا بھی تھا جو مجھے عجیب سا لگا۔ میں نے ایلورا کا ہاتھ دبا دیا۔ اُس نے میری طرف کنکھیوں سے دیکھا اور ایک گہرا سانس لے کر خاموش ہو رہی۔ بارش کا زور ٹوٹا تو اس کا شور بھی کم ہو گیا۔ اب ہم ایک دوسرے سے باتیں کر سکتے تھے۔ فلم شروع ہو گئی۔ لیکن ہم میں سے کسی کو بھی فلم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہم وہاں فلم دیکھنے نہیں آئے تھے۔ بلکہ اس لیے آئے تھے کیونکہ وہاں تنہائی میں بیٹھ کر ہم ایک دوسرے سے باتیں کر سکتے تھے۔ یا ایک دوسرے سے محبت کر سکتے تھے۔ کیونکہ باتیں کرنے سے محبت کرنا کہیں زیادہ بہتر ہے۔ میں نے ایلورا کا ہاتھ چوم لیا۔ ایلورا نے میری طرف ہلکے سے مسکرا کر دیکھا۔

"ایلورا! مجھے تو یہ سب کچھ خواب معلوم ہو رہا ہے۔ تم کسی اور دیش کی رہنے والی ہو

میں کسی دوسرے دیش کا باشندہ ہوں۔ ہم ایک اجنبی ملک میں بارش اور ہوا کے طوفان میں ایک پل کے لیے ملے ہیں اور پھر جدا ہو جائیں گے۔ تم کہیں اور چلی جاؤ گی۔ میں کہیں اور چلا جاؤں گا۔ پھر نہ کبھی تمہیں میری خبر ملے گی اور نہ مجھے کبھی تمہاری خبر ملے گی۔ ہم نے وقت کے ان رنگین لمحات کو صرف چھوا ہے۔ جس طرح کوئی تتلی کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسے ذرا سا چھو لیتا ہے اور اس کے ہاتھ میں تتلی تو نہیں آتی مگر اس کے رنگ ضرور لگ جاتے ہیں اور تھوڑی دیر بعد یہ رنگ بھی غائب ہو جاتے ہیں۔ تم ہی کہو کیا یہ سب کچھ خواب نہیں ہے؟"

ایلورا نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"جسے تم خواب کہہ رہے ہو یہ سب سے بڑی حقیقت ہے۔ خواب اصل زندگی ہے۔ ہم زندگی کو بچپن، جوانی اور بڑھاپے میں تقسیم کر سکتے ہیں لیکن خواب کو کبھی تقسیم نہیں کر سکتے۔ زندگی کا یہ وقفہ جو پیدائش سے شروع ہو کر موت پر ختم ہو جاتا ہے۔ ایک طویل خواب کی بیداری کا نام ہے۔ اس بیداری میں کبھی کبھی ہمیں اونگھ آ جاتی ہے اور ہمیں ہماری اصل زندگی اپنی جھلک دکھلا جاتی ہے کبھی سوچو تو ----- کیا کسی نے آج تک یہ بتایا ہے کہ موت کے بعد کیا ہوتا ہے؟ کس قسم کی زندگی شروع ہوتی ہے؟ ہم کہاں چلے جاتے ہیں؟ پھر ایک ایسی نامعلوم اور غیر یقینی منزل کے سفر کے لیے ہم لوگ اتنا اہتمام کیوں کرتے ہیں؟ اتنی جدوجہد کیوں کرتے ہیں؟ اتنا جھوٹ کیوں بولتے ہیں؟ اتنی برائیاں کیوں کرتے ہیں؟ ----- اتنے لوگوں کا حق کیوں مارتے ہیں؟ ہم ایک ایسی شے کو حقیقت کا نام کیونکر دے سکتے ہیں جس کی حقیقت کا ہی علم نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔

"نہیں ایلورا! زندگی بسر کرنا بذات خود ایک بہت بڑی حقیقت اور بڑا عظیم تجربہ ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم اس کی نوعیت سے بے خبر ہیں۔ اس کے باوجود قدرت کا یہ ایک بہت بڑا عطیہ ہے جو انسان کو ملتا ہے اور ہمیں اس کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہیئے۔"

"لیکن اُس فائدے کا کیا مقصد جس کے نقصان سے ہم بے خبر ہیں۔ ہو سکتا ہے جسے ہم فائدہ سمجھتے ہوں وہ حقیقت میں نقصان ہو۔ ہم ہر جائز اور ناجائز طریقے سے دولت پیدا

Murtaza A. Siddiqui
mascom4u@gmail.com
NOVELS UBLISH

ر کے اپنی اولاد کو پالتے ہیں۔ ان کے لیے جائداد چھوڑ کر مر جاتے ہیں۔ اور بعد میں یہی جائداد نسل و خون کا باعث بنتی ہے۔ ہماری اولاد بعد میں ہمیں بھول جاتی ہے۔ ایک صدی تک ہماری تصویر ان کے ڈرائنگ روم میں لگی رہتی ہے۔ پھر ان کی اولاد کی اولاد ہو جاتی ہے۔ ہماری تصویر کی جگہ ہمارے کسی پوتے یا پڑپوتے کی تصویر لے لیتی ہے۔ پھر وقت کے غبار میں وہ تصویر بھی معدوم ہو جاتی ہے اور ہمارا نشان تک باقی نہیں رہتا۔ کسی کو ہمارا نام بھی یاد نہیں رہتا۔ مثلاً مجھے اپنی پڑنانی اور اس کی نانی اور اس کے باپ کا نام نہیں معلوم۔ میں نہیں جانتی کہ وہ لوگ کیا کرنے آئے تھے اور کیا کر کے چل دیے۔"

میں نے سگریٹ سلگا کر کہا۔

"زندگی کا چکر اسی طرح رواں دواں ہے ایلورا ----- اور پھر میں کسی بھی دلکش آنکھوں اور خوبصورت ہونٹوں والی لڑکی سے بحث نہیں کر سکتا۔ خاص طور پر جبکہ باہر بارش ہو رہی ہو اور اُس لڑکی کے جوڑے میں لگے ہوئے پھولوں کی مہک اڑ رہی ہو۔"

ایلورا مسکرائی اور اس نے آنکھیں نیچی کر لیں۔ میں اپنا چہرہ اس کے قریب لے گیا۔ اتنا قریب کہ فلم کی ہلکی ہلکی روشنی میں مجھے اس کی چمکتی ہوئی شربتی آنکھیں اس جنگل کی طرح دکھائی دینے لگیں جہاں شام کی روشنی رات کے اداس اندھیروں میں گھل مل رہی ہو۔ مجھے اس کے تنفس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اور اس کا گرم گرم خوشبو دار سانس مجھے اپنے چہرے پر محسوس ہو رہا تھا۔ جوڑے کے پھول کی خوشبو تیز ہو گئی تھی۔ خوشبو دار تیل کی مہک زیادہ گہری ہو گئی تھی۔ ایلورا کا گھبرا سا نولا گرم کنوارا جسم محبت بھرا دل بن کر دھڑک رہا تھا۔ اس کے بھرے بھرے آلو چے ایسے رسدار ہونٹ ذرا سے کھلے تھے اور دانتوں کی لکیر اس طرح نظر آ رہی تھی جس طرح تڑخے ہوئے ناریل میں سے سفید سفید گودا نظر آیا کرتا ہے۔ میں نے ناریل کے اس شگاف پر ہونٹ رکھ دیے اور اس کا سارا رس ساری خوشبو میرے جسم میں پھیل گئی۔ مجھے اپنے آپ پر ناریل کے درخت کا گمان ہوا جو کسی دریا کے کنارے اکیلا کھڑا جنوبی سمندروں سے آنے والی ہواؤں میں جھوم رہا ہو۔ ایلورا کے ہونٹ گرم تھے۔ یہ وہ ناریل تھا جو گرم دوپہر میں اپنی شاخ پر سے ٹوٹ کر گلاس پر گر پڑا ہو اور ٹوٹ گیا ہو۔

میں نے اپنا چہرہ اوپر اٹھایا۔ ایلورا کی آنکھیں بند تھیں۔ سر کرسی کی پشت سے لگا تھا اور اس کے براؤن ہونٹوں پر میرے بوسے کا نشان چمک رہا تھا۔ میرے پیار کا پھول مہک

رہا تھا۔ وہ گہرے سانس لے رہی تھی اور اس کا بلاوز اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ ساڑھی کا پلو اس کے شانوں پر سے پھسل گیا تھا اور صندلیں بازو ننگا ہو گیا تھا۔ میں نے اپنا سر ایلورا کے بازو پر رکھ دیا۔ ایلورا نے بازو میری گردن میں حمائل کر دیا اور میرے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس وقت مجھے یقین ہو گیا کہ زندگی میں خواب سب سے بڑی حقیقت ہوتے ہیں۔ ہم پیدا ہی اسی لیے ہوئے ہیں کہ ایسے خواب دیکھیں لیکن یہ خواب ہمیں زندگی بھر میسر نہیں آتے۔ ہم دولت کماتے ہیں۔ صبح سے شام تک پہلے اپنے لیے، اپنے ماں باپ کے لیے اور پھر اپنی اولاد کے لیے، کولہو کے بیل کی طرح کام میں جتے رہتے ہیں۔ ہم جانوروں کی طرح کام کرتے ہیں۔ روٹی کھاتے ہیں، بچے پیدا کرتے ہیں اور مر جاتے ہیں ----- جب کوئی ہم میں سے اٹھ کر بغاوت کرتا ہے اور خواب دیکھنے شروع کر دیتا ہے تو ہم اسے اپنی محفل سے اٹھا کر باہر پھینک دیتے ہیں، اس پرزے کی طرح جو بیکار ہو گیا ہو لیکن ہمیں خبر نہیں ہوتی کہ حقیقت میں وہی بیکار پرزہ اس سارے نظام کی خوبصورتی کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ یہی خواب زندگی کی خار دار جھاڑیوں پر لگے ہوئے پھول ہیں۔ ہمارا کام صرف کانٹے پیدا کرنا، کانٹے صاف کر کے اپنی راہ بنانا اور پیچھے آنے والوں کے لیے مزید کانٹے پیدا کرنا ہے۔ پھول پیدا کرنا بالکل نہیں۔ اگر یہ خواب دیکھنے والے، یہ پھول پیدا کرنے والے دیوانے نہ ہوں، تو یہ دنیا ایک ایسی کانٹوں بھری وادی بن جائے جہاں پر انسان لہولہان اور کانٹوں سے چھدا ہوا نظر آئے۔ یہ دور فائدے اور نقصان کا دور ہے۔ اجارہ داری خود غرضی اور منصب پرستی کا دور ہے۔ ہر شخص اپنے مستقبل کو بہتر بنانے کے لیے حال کو زیروزبر کر رہا ہے۔ وہ گھوڑے کی طرح بے معنی مشقت کرتا ہے مگر کھاتا چوہیا کی طرح ہے۔ وہ ایک جھوٹی بے حقیقت اور خود پیدا کردہ محنت اور مشقت میں لگا ہے۔ جب وہ تھک ہار کر اپنے بچوں میں بیٹھ کر خوش ہونے کی کوشش کرتا ہے یا کسی سینما یا دریا کنارے جا کر گھڑی کی گھڑی تفریح کرتا ہے اور اپنی کولہو کے بیل ایسی زندگی کو بھلانے کی کوشش کرتا ہے تو وہی لمحات اس کی زندگی کے وہ حقیقی لمحات ہوتے ہیں جن کے لیے وہ پیدا کیا گیا تھا۔ لیکن صد حیف کہ وہ ان لمحات کو بیکار سمجھ کر ضائع کر دیتا ہے اور تھوڑی دیر بعد پھر کولہو کے آگے جت جاتا ہے۔ ان لوگوں نے اپنے آپ کو بہلانے اور خوش کرنے کے لیے احساسِ فرض، ذمہ داری، ایثار کیشی، محنت، اور قربانی ایسی بے معنی اصطلاحیں گھڑ رکھی ہیں۔ جب کوئی

Muraza A. Siddiqui
mascom4u@gmail.com
NOVELS UPDATES

شخص کام کرتے کرتے گر کر مر جاتا ہے تو اس کے سینے پر احساس فرض ذمہ داری یا قربانی کا خود ساختہ اور جھوٹا تمغہ لگا کر اس کی غیر قدرتی موت پر ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ قدرت نے انسان کے لیے درخت بنائے ہیں۔ جو پھل دیتے ہیں۔ سایہ دیتے ہیں۔ پھولوں کی خوشبو اڑاتے ہیں۔ اس نے انشورنس کمپنیاں نہیں بنائیں جس کے ایجنٹ بول بول کر پاگل ہو جاتے ہیں۔ قدرت نے زمین بنائی ہے۔ ریلوے لائن نہیں بنائی جو ہر روز کئی انسانوں کی لاشوں کو کاٹ کاٹ کر ان کے گھروں کو ماتم کدے بنا رہی ہیں۔ ریل، ہوائی جہاز بجلی، کارخانے۔۔۔۔۔ تہذیب حاضر کی یہ جتنی کارگھیں ہیں، ان کے فائدے ضرور ہیں۔ لیکن یہ سارے فائدے ایک خاص طبقہ حاصل کرتا ہے اور اس کے سارے نقصانات نچلے طبقے کے حصے میں آتے ہیں۔ ریل کے نیچے کبھی اعلیٰ درجے کا مسافر کٹ کر ہلاک نہیں ہوتا۔ لائن پر ہمیشہ کسی دیہاتی عورت یا دیہاتی آدمی کی لاش ہی ملے گی۔ بجلی کا ہمیں صرف اتنا فائدہ ہے کہ ہمارے گھر میں بلب جلتا ہے۔ بجلی کی مدد سے جو کارخانے اور مشینیں چلتی ہیں اس کا سارا فائدہ ایک خاص طبقہ ہی اٹھاتا ہے۔ اس کے باوجود ہمارے گھروں کے ہزاروں مستری بارش میں کھمبے پر چڑھے تاریں ٹھیک کرتے بجلی کے جھٹکے سے مر جاتے ہیں۔ سینکڑوں عورتیں اور بچے گھروں میں میلے اور ننگے تاروں سے چھو کر جاں بحق ہو جاتے ہیں۔ یہ جدید ترقی اور سائنسی دور کے مفادات کا ڈھونگ تو ایک ایسی مرغی ہے جو دانہ دنکا تو ہمارے گھر سے کھاتی ہے اور انڈا دوسرے کے گھر میں جا کر دیتی ہے۔ ہمیں یہ جنس بڑی مہنگی پڑ رہی ہے۔ ہمیں یہ ساری چیزیں اتنا فائدہ نہیں دے رہیں۔ جتنا نقصان پہنچا رہی ہیں۔ یہ جتنا کچھ ہم سے لے جاتی ہیں اس کا عشر عشیر بھی یہ ہمیں واپس نہیں کرتیں۔ اس دنیا میں ہزاروں ایسے دیہاتی ہیں جو کبھی ریل پر سوار نہیں ہوئے لیکن جو ریل کے نیچے آ کر کٹ جاتے ہیں۔ سینکڑوں ایسے لوگ ہیں جنہیں بجلی کی روشنی نصیب نہیں۔ مگر بجلی کے تاروں میں الجھ کر مر جاتے ہیں۔ جنہیں تن ڈھانپنے کو پورا کپڑا بھی نہیں ملتا لیکن کپڑے کی ملوں میں کسی مشین میں آ کر ہلاک ہو جاتے ہیں۔ زمین دوز کانوں میں سے کوئلہ نکال نکال کر گاڑیوں میں لادا جاتا ہے جس سے بڑے بڑے کارخانے چلتے ہیں۔ نئی نئی کاریں خریدی جاتی ہیں۔ نئے نئے بنگلے بنائے جاتے ہیں۔ بچوں کو کاروں میں سکول لے جایا جاتا ہے۔ شبینہ کلبوں میں عورت اور شراب پر روپیہ پانی کی طرح بہایا جاتا ہے۔ لیکن کوئلے کی کان میں جب بھی دھماکہ ہوتا ہے

تو مرتا وہی شخص ہے جسے سردیوں میں آگ تاپنے کو کوئلہ بھی میسر نہیں۔ اس کوئلے کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے والے کے جسم پر خراش تک نہیں آتی۔ تو آخر یہ ساری بک بک کس لیے؟ کیوں نہ انسان جنگل میں ننگا ہو کر نکل جائے اور درختوں کے پھل کھا کر اور چشمے کا پانی پی کر سو جایا کرے۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ اسے جنگل میں، مچھر، جنگلی درندے، چیونٹے، بھنگے اور سانپ بچھو اتنی تکلیف نہیں دیں گے جتنی تکلیف اُسے شہروں میں اس کے انسان بھائی پہنچا رہے ہیں۔ کم از کم مجھے تو بجلی، ریل، ہوائی جہاز اور ٹیلی ویژن کی اتنی شدید ضرورت نہیں کہ میں محض اس کی خاطر اپنی ماں کو ریل تلے کٹوا دوں۔ بھائی کو بجلی کے جھٹکے سے مروا دوں اور بچے کو کوئلے کی کان کے دھماکے میں ہلاک کرا دوں۔

برادران کرام! مجھے تو آپ ایک بیل گاڑی، ایک سانولے بدن کی نیم عریاں لڑکی، پانی کا ایک چشمہ، کیلوں کا گچھا اور گھنے جنگل کو جانے والا ایک کچا راستہ دے دیں اور میرا آپ کو دور ہی سے سلام!

میں نے اپنے ساتھ بیل گاڑی میں لیٹی ہوئی نیم عریاں سانولی لڑکی کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ ایلورا نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے ہونٹ کھول دیئے۔ میری زبان ناریل کے پھول کو چوسنے لگی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کولمبو کو چوم رہا ہوں۔ کولمبو کا رس پی رہا ہوں۔ کولمبو کے سمندر میں بازو پھیلائے جنوبی تیز ہواؤں میں اڑا جا رہا ہوں۔ اچانک کیبن کے دروازے پر کسی نے آہستہ سے دستک دی۔ میرا خواب ٹوٹ گیا۔ بیل گاڑی ریلوے پھاٹک پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ میں ایلورا سے الگ ہو گیا۔ اس نے جلدی سے اپنی مٹھی میں بند نتھنے سے خوشبو دار ریشمی رومال سے اپنے ہونٹ پونچھے۔ ساڑھی کا پلو درست کیا اور پھر سے اس دنیا کی ہوشیار اور چالاک لڑکی بن کر بیٹھ گئی۔ وہ جنگل کی گوالن غائب ہو گئی۔ میں نے بھی اپنی دیہاتیوں والی پگڑی پرے پھینکی۔ کیلوں کا گچھا سیٹ کے نیچے کیا اور ٹائی درست کر کے کیبن کا دروازہ کھول دیا۔

معلوم ہوا کہ انٹرول ہو گیا ہے اور بیرا کافی لے کر آیا ہے میں نے اس بیرے کو پہلے ہی سے کہہ رکھا تھا۔ وہ کافی رکھ کر چلا گیا۔ ہم کافی پینے لگے۔ پنکھے کی تیز ہوا میں ایلورا کے ماتھے پر بالوں کی ایک لٹ اڑ رہی تھی۔ اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور اپنے ریشمی رومال سے میرے ہونٹوں پر ایک طرف لگا ہوا سرخی کا نشان پونچھ ڈالا۔ میں نے کہا۔

Murtaza A. Siddiqui
murtaza4u@gmail.com

"اپنی ایک بھی نشانی میرے پاس نہیں رکھو گی؟"

ایلورا نے سلگتی آنکھیں اٹھا کر کہا۔

"میں تو شام کے وقت کسی پرانے مندر کے صحن میں چلنے والی ہوا ہوں۔ میں تمہیں کیا نشانی دے سکتی ہوں۔ تم مجھے کس طرح یاد رکھ سکو گے؟"

میں نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔

"اس پنکھے کی ہوا مندر کے صحن میں چلنے والی ہوا سے زیادہ تیز ہے لیکن یہ ہوا ہڈیوں کو خشک کرتی ہے اور وہ ہوا ہڈیوں میں خوشبو بن کر رچ جاتی ہے۔ میں اس ہوا کو کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔"

"پھر تمہیں نشانی کی ضرورت بھی نہیں۔ محبت میں نشانیاں وہ لیتے ہیں جنہیں بھول جانے کا ڈر ہوتا ہے۔ یاد رکھنے والے ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔"

"کیا تم مجھے ہمیشہ یاد رکھو گی ایلورا؟"

ایلورا نے کافی کی پیالی طشت میں رکھ کر رومال ہونٹوں سے لگا لیا اور خاموش ہو کر سامنے پردہ سیمیں کو دیکھنے لگی۔ میں نے جب اپنی بات پھر دہرائی تو اس نے بڑی دردمند نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے سمندر کنارے کی کوئی سیاہ چٹان مجھے دیکھ رہی ہو۔ اُس کی مخمور شربتی آنکھوں میں مندر کی منڈیر پر جلنے والے دیئے جل رہے تھے۔ پتلی سی تیکھی ناک ایک بھرپور عزم کے ساتھ اوپر کو اٹھی ہوئی تھی۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر یوں تھوڑا سا سر جھکایا جس طرح ہندو عورتیں مندروں میں دیوتاؤں کے سامنے پوجا کے وقت کیا کرتی ہیں۔

پھر دھیمے سے شیریں لہجے میں بولی۔

"میں تب نہ تمہیں بھلا سکی جب ابھی تم مجھے ملے نہیں تھے۔ جب تم نے مجھے دیکھا تک نہیں تھا۔ اب کیسے بھلا سکتی ہوں۔ اب تو تم مجھے مل گئے ہو میں تو اندر ہی اندر تمہیں یاد کرتی رہی ہوں۔ راستوں پر کھڑی تمہاری راہ تکتی رہی ہوں۔ حالانکہ تم نے پھر آنے کا وعدہ بھی نہیں کیا تھا۔ یہ میری محبت ہی ہے جو تمہیں پھر سے کھینچ لائی ہے۔ تم تو مجھے بُھلا بیٹھے تھے۔ تمہیں تو مجھے دیکھ کر کچھ بھی یاد نہیں آیا۔ تمہارا یادوں کا سمندر کیسے خشک ہو گیا؟ کیا تمہیں وہ لڑکی یاد نہیں، جو آج سے سو سال پہلے دریائے گومتی کے کنارے ایک جھونپڑی کے باہر تمہارا انتظار کیا کرتی تھی؟ تم کھیتوں میں کام کیا کرتے تھے۔ بارش کے پانی سے

بھرے کھیت میں دھان کی پنیری بویا کرتے تھے اور وہ لڑکی تمہارے لیے دال بھات پکایا کرتی تھی۔ چاول کوٹا کرتی تھی۔ چکی میں چاول پیسا کرتی تھی۔ سل پر مرچیں اور املی پیسا کرتی تھی۔ رات کو تمہارے پاؤں دابا کرتی تھی۔ تمہیں کھیتوں میں لسی کا کٹورا دینے جایا کرتی تھی؟ جو تمہارے بچوں کو خود جاگ کر سلایا کرتی تھی۔ صبح صبح ان کا منہ دھلایا کرتی تھی۔ انہیں بھگوان کی پوجا کروانے مندر لے جایا کرتی تھی۔ شام کو جب تم کھیتوں سے گھر آتے تو وہ ننھے منے تمہاری ٹانگوں سے لپٹ جایا کرتے تھے۔ تمہارا نام ویشنو تھا اور میرا نام ونتی۔ پھر ہم نے اپنی لڑکی بنسی کی شادی کی تھی۔ تم نے اپنے ہاتھوں بنسی کو اس کے خاوند کے حوالے کیا تھا۔ کیا تمہیں کچھ بھی یاد نہیں؟ کیا تم سب کچھ بھول گئے ہو؟"

میں بت بنا ایلورا کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ ایسے جنم کی باتیں سنا رہی تھی جس کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں تھا۔ جو باتیں میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا۔ آج اُس نے اپنے آپ شروع کر دی تھیں۔ میں حیران بھی ہو رہا تھا اور دلچسپی بھی لے رہا تھا۔ کیا یہ ٹمپل روڈ پر رہنے والی سانولے سلونے رنگ کی مدراسی لڑکی ٹھیک کہہ رہی ہے؟ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ کیونکہ مجھے پچھلے جنم کی، اگر کوئی پچھلا جنم بھی ہوتا ہے، ایک بات بھی یاد نہیں آ رہی تھی۔ پھر بھی یہ موضوع بڑا رومانٹک تھا اور اس نے ایلورا کی شخصیت کو میرے لیے مزید پُراسرار بنا دیا تھا۔ وہ مجھے پہلے سے زیادہ دلکش اور اسرار خیز معلوم ہونے لگی تھی۔ اُس کی آنکھیں زیادہ روشن اور گہری ہو گئی تھیں اور ماتھے کی سرخ بندیا گویا ایک چراغ تھا جو ہزاروں سال پرانے کسی مندر کے شکستہ استھان میں جل رہا ہو۔ وہ بولے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں نیم وا تھیں۔ چہرے پر سکون تھا اور دونوں ہاتھوں میں میرا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

"اور اس سے بھی پہلے۔۔۔۔۔ بہت پہلے۔۔۔۔۔ ہزاروں برس پہلے ہم کوہ ہمالیہ کی ترائی کے جنگلوں میں رہا کرتے تھے۔ میں تمہاری ہرنی تھی اور تم میرے ہرن تھے۔ ہمارا ایک ہی بچہ تھا۔ میں نے مہوا کی جھاڑیوں میں ٹھنڈے ٹھنڈے کنج میں تمہارے اس بچے کو جنم دیا تھا۔ ہم تینوں بڑی ہنسی خوشی زندگی بس کر رہے تھے۔ کہ اچانک ایک روز کسی شکاری نے تمہیں پکڑ لیا۔ ایک تیر تمہارے شانے میں لگا اور تم زخمی ہو کر گر پڑے۔ وہ اٹھا کر تمہیں لے گیا۔ میں تمہارے پیچھے بھاگی۔ میں نے اپنا بچہ سینے سے لگا رکھا تھا اور شکاری کی منتیں کر رہی تھی کہ اے شکاری! مجھے لے جا لیکن میرے ہرن کو چھوڑ دے۔ شکاری نے

Murtaza A. Siddiqui
mascom4u@gmail.com
NOVELS UBDU

تمہیں رہا نہ کیا۔ تمہیں یاد ہے میں نے تمہیں بیچ پر ہوٹل کے باہر بیٹھے ہوئے ہرنی کا ایک گیت سنایا تھا۔ وہ گیت بچپن ہی سے مجھے ازبر ہے۔ وہ میری ہی درد بھری کہانی ہے۔ شکاری تمہیں لے گیا۔ اُس نے مجھے بھی گھائل کر دیا۔ اس کے بعد تمہارا پیارا مکھڑا دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ میں زخمی جسم لیے بچے کو سینے سے لگائے اکیلی جنگل میں پھرتی رہی اور تمہیں پکارتی رہی۔ مگر تم کہیں نہ مل سکے۔ ایک روز میں نے اپنے بچوں کو جی بھر کر پیار کیا۔ ایک چشمے پر اکیلا چھوڑا اور خود وہاں سے چل کر درختوں کے جھنڈ میں آ گئی۔ وہ میرا دھرتی پر اُس جنم کا آخری دن تھا۔ میں اپنے بچے کے سامنے نہیں مرنا چاہتی تھی۔ میں اس کی معصوم آنکھوں میں اپنی موت کا عکس نہیں دیکھ سکتی تھی۔ میں مر گئی اور میرا بچہ چشمے کے کنارے اکیلا کھڑا میرا انتظار کرتا رہا۔ اس کے بعد میں نے ہرن کو دوسرے جنم میں پالیا لیکن میرا بچہ مجھے پھر نہیں مل سکا۔ شاید اس جنم میں اس کے بھی درشن ہو جائیں۔ میرا ہرن مل گیا ہے۔ تو مجھے میرا بچہ بھی مل جائے گا۔"

میں نے سوچا کہیں ایلورا دیوانی تو نہیں ہو گئی؟ یہ انسانوں سے چل کر جانوروں پر کیوں آ گئی۔ میں کسی نہ کسی طرح اپنے انسانی جنم کا تو قائل ہو سکتا تھا۔ لیکن جانور کے روپ کو قبول کرنا تو مجھے کسی حالت میں بھی گوارا نہیں تھا۔ میں نے کہا۔

"یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو ایلورا؟ کیا انسان جانور بھی بن سکتا ہے؟"

ایلورا نے پلکیں جھپکا کر کہا۔

"کیوں نہیں؟ جانور بھی تو انسان کی طرح ہوتے ہیں۔ بلکہ وہ تو زیادہ بھولے بھالے ہوتے ہیں۔ ان کے بھولپن کا مقابلہ تو انسان کبھی کر ہی نہیں سکتا۔ اور پھر کتابوں میں لکھا ہے کہ ہمارے بھگوان بدھ ایک بار شیرنی کے روپ میں دنیا میں آئے تھے۔ انہوں نے شیرنی بن کر کسی کو کچھ نہیں کہا تھا۔"

میں نے کہا

"لیکن تمہیں اپنے پچھلے جنم کی ساری باتیں کیسے یاد ہیں؟"

"مجھے تو ایک بات بھی نہیں بھولی۔ اگر تم گومتی کنارے میرے ساتھ چلو تو میں تمہیں وہ گاؤں بھی بتا دوں گی جہاں ہماری جھونپڑی ہوا کرتی تھی اور جہاں میں تمہارے لیے مرچیں پیسا کرتی تھی۔"

میں نے سوچ کر کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری بیٹی بنسی ضرور وہیں کہیں زندہ ہو گی۔"

ایلورا نے جھٹ جواب دیا۔

"ضرور زندہ ہو گی۔ میرا تو پختہ ایمان ہے۔ اگر ہم تلاش کرنے نکلیں تو اپنی بیٹی کا نہیں تو اس کی اولاد کا سراغ ضرور مل جائے گا لیکن کتابیں ہمیں ایسا کرنے سے منع کرتی ہیں۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ ہمیں صرف پچھلے جنم کے اپنے اور اپنے پتی یا بیوی کے روپ سے سروکار ہونا چاہیے اور کسی سے نہیں۔ اسی لیے تو میں نے تمہیں پہچان لیا تھا۔ اور صرف تم ہی کو یاد رکھا تھا۔ کیا تمہیں اب بھی میں یاد نہیں آ رہی؟"

میں نے کہا!

"بالکل نہیں! ایلورا! میں دماغ پر جتنا بھی زور ڈالتا ہوں۔ مجھے سوائے اندھیرے کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ مجھے تو اپنی بچپن کی بھی شکل ٹھیک سے یاد نہیں پھر میں اُس سے بھی پہلے کا حُلیہ کیسے یاد کر سکتا ہوں۔ تعجب ہے تمہیں ایک ایک بات یاد ہے۔"

"میں کیسے بھول سکتی ہوں۔ یہ تو میری ساری زندگی کا نچوڑ ہے۔ عورت سب کو بھلا سکتی ہے مگر اُسے نہیں بھلا سکتی جس سے اُس نے دل سے محبت کی ہو اور جس نے اس کی گود میں چاند سا بچہ دیا ہو۔"

اتنا کہہ کر وہ خود ہی شرما سی گئی اور آنکھیں جھپکا کر چپ ہو گئی۔ جانے کب سے فلم شروع ہو چکی تھی۔ پردہ سیمیں پر ایک آدمی گھوڑے پر کسی لڑکی کو بٹھلائے سرپٹ گھوڑا دوڑائے بھاگا چلا جا رہا تھا۔ لڑکی ٹانگیں چلا رہی تھی۔ مگر اس شخص پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ ہال میں لوگ تالیاں بجا رہے تھے۔ سینما ہال کی چھت پر کسی وقت بارش کا شور گونج اٹھتا اور کسی وقت پھر جیسے کہیں معدوم ہو جاتا۔ میں نے ایلورا کا چہرہ ہاتھ سے اوپر اٹھایا۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ میں نے تمہیں چاند سا بچہ دیا تھا؟"

ایلورا نے جواب دینے کی بجائے آہستہ سے سر ہلایا اور آنکھیں بند کر کے گہرا سانس لیا۔ میرے بدن پر ایک کپکپی سی طاری ہو گئی۔ کیسی عجیب بات تھی کہ ایک کنواری لڑکی جسے آپ نے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔ جس سے آپ پہلے کبھی نہ ملے ہوں۔ اچانک آپ سے ملے اور کہے کہ آپ اُس کے بچے کے باپ ہیں۔ وہ بچہ جو عرصہ ہوا مر کھپ گیا ہے اور جو انسان کے بجائے ایک ہرن تھا۔ یہ سارا کچھ مجھے یونانی دیومالا کا ایک حصہ معلوم ہونے لگا جس میں انسان بچھڑا بن جاتا ہے اور دیویوں کے جل پریاں پیدا ہوتی ہیں۔

NOVELS URDU STORIES
Murtaza A. Siddiqui
mascom4u@gmail.com

8

ہم سینما ہال سے باہر نکلے تو سمندر کی طرف سے ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔

ایلورا کی پیازی ساڑھی کا پلو پھڑ پھڑا رہا تھا جسے وہ بار بار سنبھال رہی تھی۔ آسمان بادلوں میں چھپا ہوا تھا جن میں سے دن کی ہلکی ہلکی روشنی اپنی آخری جھلک دکھاتے ہوئے شام کے اداس اندھیروں سے دست و گریبان ہو رہی تھی۔ میں نے ایلورا کی طرف نظر بھر کے دیکھا۔ وہ مجھے اب ایک دوسری عورت معلوم ہو رہی تھی۔ زندہ، صحت مند اور اس جدید سائنسی دور کی جاگتی عورت ----- جیسے پچھلے جنم کی بھول بھلیوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک بدستور تھی۔ اس چمک میں ماضی کے ان گنت روحانی دور جھلک رہے تھے۔ میں اسے گاڑی میں بٹھلا کر اس کی سہیلی کے گھر تک چھوڑنے آیا۔ گاڑی میں ایلورا خاموش بیٹھی رہی۔ اُس نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ جب اس کی سہیلی کا گھر آگیا تو میں نے پوچھا۔

"پھر کب ملو گی ایلورا؟"

ایلورا نے دھیرے سے کہا۔

"اگلے منگل وار کو۔"

"اس سے پہلے نہیں؟"

"نہیں"

"اگر ملنا چاہو تو فون کر لینا۔"

میں نے اُسے اپنے فون کا نمبر دیا۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر مجھے پرنام کیا اور گاڑی میں سے نکل کر اُس بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھ گئی جہاں اُس کی سہیلی رہتی تھی۔ میں نے گاڑی سمندر کے کنارے جا کر چھوڑ دی۔ اس رات میں کتنی دیر تک سمندر کے کنارے گھومتا پھرتا رہا۔ مجھے بار بار ایلورا کی محیر العقول باتوں کا خیال آرہا تھا۔ کیا واقعی میں کسی پچھلے جنم میں ہرن رہ چکا ہوں اور پھر اس کے بعد کے جنم میں ایلورا کا خاوند رہ چکا ہوں۔ اور میری ایک بیٹی بھی تھی جس کا نام بنسی تھا؟ کتنی عجیب بات ہے۔ کتنا عجیب ذہنی تجربہ ہے۔

میں رات گئے گھر واپس آیا

رات کوئی ساڑھے بارہ بج رہے ہوں گے میں نے کھانا بھی باہر ہی کھا لیا تھا۔ اولمس پیلس کے گیٹ میں داخل ہوا تو دیکھا کہ مسز جونس برآمدے میں آرام کرسی پر نیم دراز ہے۔ سامنے میز پر شراب کی بوتل اور ایک گلاس پڑا ہے۔ کونے والا سرخ بلب جل رہا ہے۔ مسز جونس رومن کیتھولک تھی۔ وہ کونے میں یسوع مسیح کے چھوٹے سے بت کے آگے سرخ بلب ساری رات جلائے رکھتی۔ میرے قدموں کی آواز سن کر اس نے نیم وا آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ اُس کی آنکھیں مخمور ہو کر سُرخ ہو رہی تھیں۔ میں رک گیا۔

"ہیلو مسز جونس۔"

وہ ذرا سا مسکرائی اور میرا ہاتھ پکڑ کر بولی۔

"تم بڑے ونڈر فل ہو مسٹر وصی! سگریٹ ہیں تمہارے پاس؟"

میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر میز پر رکھ دیئے۔ مسز جونس نے سگریٹ سلگایا۔ میں نے دوسرے لوگوں کا پوچھا کہ آج وہ کہاں ہیں۔ مسز جونس نے نفرت سے سر مار کر کہا۔

"سب مر گئے۔ سب نامرد ہیں۔ سب ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ میں اکیلی رہ جاتی ہوں ----- تم بیٹھو گے نہیں مسٹر وصی؟"

میں پہلے ہی بڑا اداس تھا اور نیند کوسوں دور تھی۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا۔

"پیو گے؟"

"صرف ایک پیگ۔"

مسز جونس نے بڑی خوشی کے ساتھ میرے لیے ایک ڈبل پیگ بنا دیا۔ آج وہ سکاچ وسکی پی رہی تھی۔ اُس نے بتایا کہ اُس کی بڑی بہن کی سالگرہ تھی۔ سب لوگ وہیں گئے ہوئے ہیں۔

"گھر میں سوائے میرے اور کوئی بھی نہیں۔ میں تو اپنی بوتل اٹھا کر چلی آئی۔ آخر سالگرہوں میں رکھا کیا ہے؟ اب دیکھو میری عمر چالیس کے قریب ہے۔ لیکن میں نے کبھی اپنی سالگرہ نہیں منائی۔ مجھے تو ایسی باتوں سے نفرت ہے۔"

میں نے گلاس حلق میں انڈیل کر پوچھا۔

NOVELS UPDATE STORIES
Murtaza A. Siddiqui
mascom4u@gmail.com

"وہ لوگ کب آئیں گے؟"

مسز جونس نے سر ہلا کر کہا۔

"کہیں صبح واپس ہوں گے۔ بچے بھی وہیں ہیں۔ انہوں نے انگریزی بینڈ باجہ منگوا رکھا تھا۔ عجیب اوٹ پٹانگ گانے بجا رہا تھا۔ میرے تو سر میں درد ہونے لگا۔ اور دوں؟"

"نہیں بس کافی ہے۔"

"تم تو ایسا نہ کہو۔ تم تو مرد ہو۔ میرا خاوند تو نامرد ہے۔ بالکل نامرد۔ وہ پیگ پی کر ڈاؤن ہو جاتا ہے۔ مجھے تم اسی لیے پسند ہو کہ تم مرد ہو۔ پورے مرد۔"

اُس نے کھلکھلا کر ایک قہقہہ لگایا اور میرے لیے دوسرا ڈبل تیار کر دیا۔ میں نے چار و ناچار اپنی مردانگی کی عزت رکھنے کی خاطر پی لیا۔ اب باقاعدہ شراب کا دور چل پڑا۔ کوئی پاؤ بھر بوتل مسز جونس پہلے ہی پی گئی تھی۔ اب جو مزید دو ایک پیگ اور پیئے تو وہ نشے میں ہو گئی اور بہکی بہکی باتیں کرنے لگی۔ میں نے بوتل میں کارک لگا کر اُسے میز کے نیچے رکھ دیا۔ مسز جونس نے لاکھ شور مچایا مگر میں نے بوتل دینے سے انکار کر دیا۔ سگریٹ اُس کے ہاتھ سے گر پڑا۔ اُس نے گون کا دامن جھٹک دیا۔ اس کی ٹانگیں اوپر ننگی ہو گئیں۔ میں نے آنکھیں دوسری طرف کر لیں۔ حسب عادت اُس عورت نے نیچے کچھ نہیں پہن رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں سُرخ ہو کر چڑھ سی گئی تھیں۔ اس کا سر پوری طرح کھڑا نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اُسے دائیں بائیں مار رہی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"مسز جونس اب تمہیں آرام کرنا چاہیئے۔ آؤ میں تمہیں خواب گاہ میں چھوڑ آؤں؟"

مسز جونس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مسکرا کر بولی۔

"ونڈرفل بوائے۔۔۔۔۔ مائی پریٹی بوائے۔۔۔۔۔"

وہ میرا بازو تھامے، میرے کندھے پر جھکی۔ لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ خواب گاہ کی طرف چل پڑی۔ ہال کمرے میں دھیمی سی روشنی ہو رہی تھی۔ یہ روشنی عقبی برآمدے کی بتی سے اندر آ رہی تھی۔ میں پردہ اٹھا کر اس کی خواب گاہ میں داخل ہوا۔ اندر اندھیرا تھا۔ مسز جونس نے میرے گلے میں دونوں بازو ڈال کر کہا۔

"دروازے کے ساتھ بتی کا بٹن ہے۔"

میں نے بٹن دبایا۔ کمرہ روشن ہو گیا۔ میں اُسے بڑی مشکل سے قدم قدم چلاتا اُس کے

پلنگ تک لایا۔ اس کا پلنگ بہت بڑا تھا اور وہاں سبز رنگ کا ایک کمبل پڑا تھا۔ جس کا رنگ مٹیالا ہو رہا تھا۔ کمرے کی فضا میں سے اُبلی ہوئی گاجروں کی بُو آ رہی تھی۔ میں نے مسز جونس کو پلنگ پر ڈال دیا۔ وہ جانے کیوں مجھ سے لپٹتی جا رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی چھاتیاں سرہانوں کی طرح میرے جسم سے لگ کر دبی جا رہی تھیں۔ اس کا سارا جسم ہی ایک بڑا سرہانہ تھا۔ میرے حواس باختہ ہو رہے تھے۔ نشہ نصف ہرن ہو گیا تھا۔ میں نے اُسے بستر پر لٹا کر کہا۔

"شب بخیر۔"

"نہیں مسٹر وصی!۔۔۔۔۔ تم مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ میں ڈرتی ہوں۔ دیکھو۔ دیکھو رات کالی ہے۔ ڈراؤنی ہے۔ اور بارش۔۔۔۔ باہر بارش ہونے لگی۔ اے اللہ! میں خود کشی کر لوں گی۔ اکیلی خود کشی کر لوں گی۔۔۔۔۔ مسٹر وصی! تم۔۔۔۔۔ تم مجھے مارنا چاہتے ہو؟ مسٹر وصی نہیں نہیں تم ایسا نہیں کر سکتے۔۔۔۔۔ تم ۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ نہیں ۔۔۔۔۔ بارش ۔۔۔۔۔ مسٹر وصی پلیز۔۔۔۔۔ پلیز۔۔۔۔۔ میں اکیلی عورت ہوں۔۔۔۔۔ کوئی میرا نہیں ۔۔۔۔۔ میرا خاوند نامرد ہے۔ میرے بچے اُس کے نہیں۔ یہ اُس کے نہیں۔۔۔۔۔ ایک بچہ اس کانے کا ہے۔ اور دوسرا ۔۔۔۔۔ اخ تھو۔۔۔۔۔ ڈرٹی!۔۔۔ ڈرٹی۔۔۔ مسٹر وصی۔۔۔۔"

واقعی باہر بارش شروع ہو گئی تھی۔ چھت پر بارش کا شور بلند ہو رہا تھا۔ ایک بار پھر بڑے زوروں کا مینہ شروع ہو گیا تھا۔ نشے کے عالم میں مسز جونس کے منہ سے نکلی ہوئی باتیں سُن کر میں ہکا بکا ہو رہا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ سچ بول رہی ہے۔ لیکن اُسے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔ شراب پی کر عورت۔۔۔۔۔ خاص کر عورت کبھی جھوٹ نہیں بول سکتی۔ اب میں وہاں سے بھاگنا چاہتا تھا۔ مجھے وہاں سے ڈر محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن مسز جونس میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی۔ اُس نے میرا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اور مجھے پلنگ پر بٹھلائے شراب میں دُھت اوٹ پٹانگ باتیں سنا رہی تھی۔ نشہ مجھے بھی ہو رہا تھا۔ مگر میں اپنے حواس میں تھا اور دوسرے مجھے نیند بھی آ رہی تھی۔ جب میں نے اُسے سلانے کی کوشش کی تو اُس نے لجاجت سے کہا۔

"تھوڑی سی شراب اور پلا دو مسٹر وصی۔۔۔۔۔ پریٹی بوائے بس ایک جام اور پلا دو۔

NOVELS URDU STORIES
Murtaza A. Siddiqui
mascom4u@gmail.com

پھر میں سو جاؤں گی۔"

جب اس نے وعدہ کر لیا کہ وہ ایک جام پی کر سو جائے گی۔ تو میں نے اسے تھوڑی سی شراب اور پلا دی۔ شراب پی کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں دبے پاؤں کمرے سے باہر آ گیا۔ اپنے کمرے میں آ کر میں نے اندر سے چٹخنی لگائی۔ کپڑے اتار کر شب خوابی کا لباس پہنا اور بتی بجھا کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ باہر بارش بڑے زوروں کی ہو رہی تھی۔ ہوا درختوں میں سے چیختی ہوئی گزر رہی تھی۔ بارش کے چھینٹے سمندر کی لہروں کی طرح ------ کوٹھی کی دیواروں سے ٹکرا رہے تھے۔ میرے کمرے کی صرف ایک کھڑکی کھلی تھی۔ جس میں سے تیز اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اندر آ رہے تھے۔ ٹھنڈ ہو گئی تھی۔ میں نے چادر اوپر کر لی اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ پہلے میں گل زیب اور ثریا کے بارے میں سوچتا رہا۔ ثریا اچھی صحت مند گول مٹول سی بھرے بھرے سینے والی لڑکی تھی۔ اگر اس سے بھی عشق کر لیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ پھر ایلورا کے متعلق سوچنے لگا۔ اس کا گھرا سا نولا ہندی چہرہ آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ اس کی پراسرار باتیں کانوں میں گونجنے لگیں۔ مجھے اس خیال سے بڑی سنسنی محسوس ہوئی کہ وہ اپنے آپ کو میری بیوی سمجھ رہی ہے۔ میں نے سوچا اگر میں اس کا خاوند ہوں تو وہ پھر مجھ سے دور دور کیوں ہے؟ اسے تو اس وقت میری خواب گاہ میں میرے پاس ہونا چاہیئے تھا۔ میرا سر چکرانے لگا۔ میں نے ایک گلاس پانی کا پیا اور پلنگ پر دوبارہ لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ شاید مجھے نیند آ گئی۔ کیونکہ پھر میرے کانوں میں بارش کی آواز ہلکی ہو گئی تھی۔ جاگنے میں کتنی دیر اس نیم خوابی کے عالم میں پڑا رہا ہوں گا کہ اچانک دروازے پر بار بار دستک دینے کی آوازوں نے مجھے جگا دیا۔ میں بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

مجھے یوں لگا جیسے ایلورا باہر کھڑی دروازے پر دستک دے رہی ہے۔ کیونکہ میں اس سے پہلے خیال ہی خیال میں ایلورا سے باتیں کر رہا تھا اور اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دے رہا تھا۔

میں نے اسی عالم میں اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا اندر آیا اور اس کے ساتھ ہی مسز جونس آتے ہی میرے پلنگ پر بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھ باندھ کر بولی۔

"خدا کے لیے مجھے بچا لو وصی! میں خود کشی کر لوں گی۔ میں مر جاؤں گی۔ میرے کمرے

میں بھوت رہتا ہے۔ وہ کلہاڑا لے کر وہاں کھڑا ہے۔ میں مر جاؤں گی۔ میں اپنے کمرے میں اکیلے نہیں جاؤں گی۔ خدا کے لیے مسٹر وصی ------"

میری جان عجیب مصیبت میں آ گئی تھی۔ میں نے اسے صراحی میں سے پانی پلایا۔ سگریٹ جلا کر دیا۔ پھر میں نے اسے سمجھایا کہ اس کے کمرے میں کوئی بھوت نہیں رہتا۔ لیکن مسز جونس تو پاگل ہو رہی تھی۔

"اگر تم اتنے سنگدل ہو کہ مجھے ہلاک کروانا چاہتے ہو تو میں یہاں سے نکل جاؤں گی۔ کولمبو کی سڑکوں پر ننگی پھرنا شروع کر دوں گی۔ پھر تم سب لوگوں کو ہوش آ جائے گا۔ میں نشے میں نہیں ہوں۔ اچھا تم میرے ساتھ چلو۔ چل کر اس بھوت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لو------ چلو میرے ساتھ۔"

میں خدا سے دعائیں مانگ رہا تھا کہ وہ کسی طرح سے وہاں سے نکلے۔ چنانچہ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے ایک بار پھر لے کر اس کی خوابگاہ کی طرف چل پڑا۔ اس کی خواب گاہ کا دروازہ کھلا تھا اور اندر اندھیرا چھا رہا تھا۔ عقبی باغ کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں بارش کا زبردست شور اور ٹھنڈی بارش میں بھیگی ہوئی ہوا اندر آ رہی تھی۔ خواب گاہ میں آ کر مسز جونس مجھ سے لپٹ گئی اور پلنگ کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

"وہ دیکھو۔ وہ ہے بھوت ------ دیکھو وہ میرے پلنگ پر لیٹا مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ میں اس پلنگ پر نہیں لیٹوں گی۔ میں اکیلی نہیں لیٹوں گی۔ مسٹر وصی! یہ بھوت مجھے مار ڈالے گا------ میں ابھی مرنا نہیں چاہتی------"

میں بڑے مخمصے میں پھنس گیا تھا۔ نیند سے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ سر درد کرنے لگا تھا۔ دوسری جانب مسز جونس کا گرم گرم پختہ اور تجربہ کار جسم میرے ساتھ لگا ہوا تھا اور میرا ضمیر بڑی شدید کشمکش میں مبتلا تھا۔ اس نے مجھے پاگلوں کی طرح کھینچ لیا اور میرا منہ چومنے لگی۔ میں نے اسے پیچھے کیا۔ سگریٹ میرے ہاتھ سے گر پڑا۔ میں نے اسے پاؤں تلے مسل دیا۔ مسز جونس نے دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی۔

"تم مجھے اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ نہیں جا سکتے۔ میں اکیلی ہوں۔ کئی سالوں سے اکیلی ہوں۔ مجھے کبھی کسی مرد کا لمس نصیب نہیں ہوا۔ میں بھی عورت ہوں اور عمر کے اس حصے میں ہوں جہاں ایک عورت کو مرد کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن میرے

Murtaza A. Siddiqui
masoom4u@gmail.com
NOVELS
UPLOADED BY

پاس کوئی بھی نہیں۔ کوئی بھی نہیں ۔۔۔۔۔ وہ کاناب میرے پاس نہیں آتا۔ کہتا ہے کہ میرے جسم سے گھوڑے کے پسینے کی بو آتی ہے۔ کیا میرا جسم ایسا ہے وصی! سچ سچ کہو۔ کیا میرے جسم سے بو آتی ہے؟ نہیں نہیں۔ اگر آتی بھی ہے تو میں کیا کروں۔ میں عورت ہوں۔ عورت ۔۔۔۔۔ جس کا خاوند نامرد ہے۔ جو مجھے چوم کر چھوڑ جاتا ہے۔ میرے جسم میں آگ لگا کر چلا جاتا ہے۔ میں شراب پی پی کر پاگل ہو جاتی ہوں۔ نشے میں چور ہو کر بستر پر گر پڑتی ہوں۔ شاید نیند آجائے۔ مگر نیند بالکل نہیں آتی۔ عورت کی نیند مرد کے طاقتور جسم میں ہے۔ شراب میں نہیں۔ بتاؤ میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ کیا میں ٹیکسی بن جاؤں؟ میں ایسا بھی تو نہیں کر سکتی۔ میں جائداد والی ہوں۔ تم کہو تو میں ایک کوٹھی منت دے دیتی ہوں۔ تم چاہے عمر بھر وہاں رہو۔ میں تم سے ایک پائی بھی کرایہ وصول نہیں کروں گی ۔۔۔۔۔ میں تمہیں صرف تمہیں چاہتی ہوں۔ کیونکہ تم مرد ہو۔ پورے مرد ہو۔ میں تمہارے جسم کی طاقت کو محسوس کر رہی ہوں۔ کیا تم مجھے اسی طرح تڑپتا چھوڑ کر جاؤ گے؟ کیا تم بھی سنگدل ہو؟ میرے خاوند کی طرح؟ بولو مسٹر وصی؟"

میں سگریٹ جلا کر خوابگاہ کے فرش پر چکر لگانے لگا۔ پھر میں کھڑکی کے پاس باغ کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ بارش بڑی تیز ہو رہی تھی۔ ہلکی ہلکی پھوار میرے ماتھے پر پڑنے لگی۔ میرا جسم گرم ہو کر سخت پتھر کی طرح ہو گیا۔ آنکھیں اور ہاتھ کی انگلیاں جلنے لگیں۔ منہ کا ذائقہ کڑوا ہو گیا۔ خوابگاہ میں اندھیرا تھا۔ باہر باغ میں اندھیرا تھا۔ اور تیز بارش کے شور کے سوا وہاں کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ مسز جونس پیچھے سے آکر مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ بالکل عریاں تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

کوئی ایک گھنٹے بعد جب میں اس کے کمرے سے باہر نکل رہا تھا تو مسز جونس اپنے پلنگ پر منہ کھولے بے سدھ ہو کر سو رہی تھی۔ اس بچے کی طرح جس نے خوب سیر ہو کر دودھ پی لیا ہو۔ بارش ہلکی ہو گئی۔ بادل بدستور گرج رہا تھا اور بجلی بھی چمک رہی تھی۔ میں نے خواب گاہ کا دروازہ بند کیا اور اپنے کمرے میں آکر سو گیا۔

صبح دیر سے اٹھا۔ منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کرنے ہال کمرے میں آیا تو مسز جونس میرے لیے ٹوسٹ بنا رہی تھی۔ میری آنکھیں اوپر نہیں اٹھ رہی تھیں۔ مگر مسز جونس کے معمول میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ روز کی طرح مسکرا رہی تھی اور بڑی ہنس ہنس کر مجھ سے

باتیں کر رہی تھی۔ اس کا خاوند اور بچے ابھی تک نہیں آئے تھے۔ اس نے بتایا کہ وہ دوپہر کا کھانا کھا کر آئیں گے۔ پھر میرے لئے چائے بنا کر بولی۔

"رات بڑی بارش ہوئی۔ میں تو باہر برآمدے میں بیٹھی شراب پی رہی تھی۔ مجھے اندر کون لے گیا؟ کیا تم مجھے سلانے آئے تھے؟ ارے مجھے تو کچھ بھی ہوش نہیں۔"

میں نے شکر کیا کہ اسے کچھ خبر نہیں۔ چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ لیکن پھر وہ مسکرا کر میری طرف کنکھیوں سے دیکھ کر بولی۔

"تم بڑے اچھے ہو پرسٹی لوائے ۔۔۔۔۔ اگر تم میری دلجوئی نہ کرتے تو رات میں نے خود کشی کر لی تھی۔ تم واقعی بڑے زبردست مرد ہو۔ میں نے تو تم ایسا مرد آج تک نہیں دیکھا۔ کیا تم شرما رہے ہو؟ کیوں؟ میری عمر چھتیس سال ہی تو ہے۔ یہ کوئی زیادہ عمر تو نہیں ۔۔۔۔۔ تم چاہو تو روز میری خوابگاہ میں آسکتے ہو۔ میں باغ والی کھڑکی کھلی رکھ کر سوتی ہوں۔"

پھر قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ اس قہقہے میں زندگی کی ساری رعنائیاں بھری ہوئی تھیں۔ اس عورت کا قہقہہ زندگی سے کس قدر بھرپور اور کنواری لڑکیوں ایسا تھا! اس قہقہے کے ساتھ جب مجھے خیال آیا کہ یہ عورت کل رات میرے ساتھ ایک ہی پلنگ پر سو رہی تھی۔ تو مجھے بالکل ندامت محسوس نہ ہوئی۔ لیکن یہ تو ہر رات خوابگاہ کی کھڑکی کھلی رکھنے والی بات تھی۔ اس سے مجھے خوف محسوس ہوا۔ میں نے جھرجھری لی اور چائے حلق میں ڈال کر دفتر کی طرف روانہ ہو گیا۔

دفتر پہنچا تو وہاں ایک نیا گل کھلا ہوا تھا۔

معلوم ہوا کہ دفتر کی سٹینو مس روتھ نے حوالدار پیارا سنگھ سے شادی کا اعلان کر دیا ہے۔ دفتر میں سب کے نام دعوت نامے آئے ہوئے تھے۔ یہ دعوت نامے پیارا سنگھ نے بڑے پیسے خرچ کر کے کولمبو کے اعلیٰ ترین پریس سے چھپوائے تھے۔ روتھ نے دفتر سے چھٹی کر رکھی تھی۔ کیونکہ دو بجے سول کورٹ میں اس کی شادی ہونے والی تھی۔ حوالدار پیارا سنگھ دفتر آیا ہوا تھا۔ خوشی سے اس کا چہرہ پھٹا جا رہا تھا۔ وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ اور بار بار ہر ایک سے ہاتھ ملا رہا تھا۔ جب اس نے مجھ سے بھی ہاتھ ملایا تو میں نے پوچھا۔

"ویسے تو یہ بڑی خوشی کی بات ہے پیارا سنگھ۔ مگر تمہاری پہلی بیوی کا کیا بنے گا۔؟

Murtaza A. Siddiqui
mascom4u@gmail.com
URDU NOVELS

کیا وہ ایک سوکن برداشت کر لے گی۔"

پیارا سنگھ آنکھ مار کر بولا۔

"بادشاہو! پہلے گھی کھالیں۔ پھر سوچیں گے کہ یہ ہضم کرے گا بھی یا نہیں۔"

مگر پیارا سنگھ تمہارے مذہب میں تو دوسری شادی نہیں کی جاتی۔"

"بادشاہو! میم میم ہوتی ہے۔ کلونت کور کو اس کے گھر بھیج دوں گا۔ اب تو میرے بچے انگریز ہوں گے۔ اور پھر سچی بات تو یہ ہے کہ میں روتھ سے پریم کرتا ہوں۔ وہ بھی مجھے چاہتی ہے۔ ہم دونوں سوچ سمجھ کر شادی کر رہے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔

"کیا تم اسے واپس گاؤں لے جاؤ گے؟"

"کیوں نہیں؟"

"وہ تمہارے گاؤں میں رہ لے گی؟"

"بادشاہو! میں نے اس سے ساری بات کر لی ہے۔ وہ ہمارے گاؤں کی لسی پیے گی تو اسے ہوش آجائے گی۔ کہتی ہے کہ میں تمہارے ساتھ جیل میں بھی رہ سکتی ہوں۔ پریم بڑی شے ہوتی ہے بابو۔"

میں جانتا تھا کہ روتھ پیارا سنگھ کے ساتھ جیل میں تو رہ سکتی ہے۔ لیکن اس کے گاؤں میں دو روز بھی نہیں رہ سکتی۔ لیکن میں ان کے ذاتی معاملات میں دخل نہیں دینا چاہتا تھا۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ دونوں شادی کے بعد زیادہ خوش رہیں۔ اور ہر بات کو ہنسی خوشی برداشت کرتے چلے جائیں۔ پیارا سنگھ نے بتایا کہ شادی کے بعد وہ گیریژن سے اٹھ کر روتھ کے پاس چلا جائے گا۔ اس نے اس کی میجر صاحب سے اجازت لے لی تھی۔

دوپہر کو ہمارے دفتر کا سارا عملہ عدالت میں پہنچ گیا۔ روتھ کے کچھ دوسرے دوست بھی آئے ہوئے تھے۔ اس نے سفید شیفون کا شادی والا جوڑا پہن رکھا تھا۔ اور ہاتھ میں گلدستہ تھامے ہوئے تھی۔ پیارا سنگھ نے سوٹ پہن رکھا تھا۔ گرمی کے مارے اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ شادی ہو گئی۔ سب دوستوں کی مبارکبادوں کے شور اور ہنسی مذاق کے قہقہوں میں وہ لوگ گاڑی میں سوار ہو کر گال میٹس ہوٹل میں آگئے۔ یہاں شام کو ایک پر تکلف دعوت دی گئی۔ کھانے کے بعد پیارا سنگھ اور روتھ نے ہم سب سے مسکرا مسکرا کر ہاتھ ملایا اور اپنے

گھر کو روانہ ہو گئے۔ دوسرے روز دونوں میاں بیوی ہنی مون منانے کولمبو سے دور کاندی چلے گئے۔

شام کو میں نے اولمس پیلس والوں کو آکر اس شادی کی خبر سنائی تو مسٹر جونس نے بڑا افسوس ظاہر کیا کہ ایک اچھی خاصی امریکی عورت ایک سکھ کے پلے پڑ گئی۔ یہ لوگ لان میں بیٹھ کر حسبِ عادت بیئر پی رہے تھے۔ مسٹر جونس نے خبر سن کر کہا۔

"میں دعوے سے کہتا ہوں کہ وہ دونوں کبھی خوش نہیں رہیں گے۔ امریکی عورت کبھی کسی ہندوستانی کے ساتھ زندگی بسر نہیں کر سکتی۔ دونوں کی طبیعتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ دونوں کے کلچر جدا ہیں۔ ہر چیز جدا ہے"۔

مسز جونس نے بیئر کا گلاس پی کر کہا۔

"یہ سب بکواس ہے۔ کلچر، ملک، طبیعت --- سب بکواس ہے۔ عورت کو صرف مرد کی ضرورت ہوتی ہے۔ جتنا کوئی زیادہ مرد ہو گا۔ اتنی دیر عورت اس کے پاس رہے گی۔ اگر ایسا نہ ہو تو ایک ہی ملک میں رہنے والوں میں کبھی طلاقیں نہ ہوں۔"

مسٹر جونس خاموش ہو گئے اور بڑی تیزی سے بیئر کا گلاس چڑھا گئے۔ اس شخص کا چہرہ ایک دم زرد پڑ گیا اور ٹھڈی نیچے کو لٹک گئی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اس رات مسز جونس نے اپنے خاوند کے بارے میں جو باتیں کی تھیں وہ بالکل سچ تھیں۔ میں مسز جونس کے پاس والی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اور اُن میں شام کا اندھیرا اتر آیا تھا۔ مسز جونس نے میرے گلاس میں بیئر ڈالتے ہوئے اپنا پاؤں میرے پاؤں سے دبایا اور مسکرا دی۔ سامنے کانا عاشق بیٹھا اپنی دیسی شراب پیے جا رہا تھا اور ہماری باتوں سے بالکل بے خبر تھا اور بار بار کوٹھی کے گیٹ کی طرف دیکھ لیتا تھا جہاں اسے امید تھی کہ اس کی بطخ ایسی محبوبہ آئے گی۔ مسز جونس کے دونوں بچے سامنے والی کوٹھی کے عقبی باغ میں کھیل رہے تھے۔ ان کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ہوا بند تھی اور شام گرم ہو رہی تھی۔ لان میں بیٹھے ہمیں مچھر کاٹ رہے تھے۔ بیئر کے چوتھے گلاس کے بعد مچھر کے ڈنگ میرے جسم پر بے اثر ہو گئے۔ اتنے میں برآمدے میں پڑے ہوئے فون کی گھنٹی بجی۔ مسز جونس ننگے پاؤں دوڑ کر فون کے پاس گئی۔ پھر مسکراتی ہوئی میرے پاس آکر بولی۔

"مسٹر وصی! تمہارا فون ہے۔ کوئی لڑکی بول رہی ہے۔"

NOVELS URDU STORIES
Murtaza A. Siddiqui
murtaza4u@gmail.com

پھر وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ میں نے برآمدے میں جا کر ریسور اٹھایا۔

"میں وصی بول رہا ہوں۔"

"میں ثریا بول رہی ہوں۔"

میں ہلکے ہلکے نشے میں تھا۔ اس وقت ثریا کی آواز سن کر طبیعت باغ باغ ہو گئی۔ گل زیب کی کوٹھی کے باغ والی ملاقات یاد آ گئی۔ ثریا بھی یاد آ گئی۔ گول گول چہرے والی صحت مند لڑکی جس کی ٹھوڑی پر سیاہ تل تھا اور جو گوجرانوالے کی رہنے والی تھی۔ مجھے گوجرانوالے کے خربوزے بھی یاد آ گئے۔ جو بڑے میٹھے ہوتے ہیں۔ ثریا نے مجھے بتایا کہ وہ کل صبح میرے دفتر سٹوڈیو دیکھنے آ رہی ہے۔ میں نے کہا ہے نصیب!۔۔۔۔ کہنے لگی۔

"میں نے ڈرتے ڈرتے آپ کو فون کیا ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"سوچتی تھی کہ آپ کیا خیال کریں گے۔"

"کیا کسی کو فون کرنا بری بات ہے ثریا؟"

میں بیئر کے نشے میں زیادہ ہی رومانوی ہوا جا رہا تھا۔

"جی نہیں بری بات تو نہیں۔ پھر بھی میں ذرا جھجک رہی تھی۔"

میں ہنس پڑا۔

"ثریا! تم بڑی بھولی ہو۔ تم واقعی جنگل کا پھول ہو۔"

"جی؟"

"میں نے کہا کہ تم واقعی جنگل کا پھول ہو۔"

"ہی ہی ہی۔"

"تمہاری مسکراہٹ میں اس ملک کی خوبصورتی کا بھید چھپا ہوا ہے۔ تم آتش فشاں پہاڑ کی چوٹی پر کھلا ہوا شگوفہ ہو۔ تم ماؤنٹ ایورسٹ ہو۔ کلی منجارو ہو۔"

"یہ آپ کیسی باتیں کر رہیں ہیں کہیں کچھ پی تو نہیں لیا؟"

"اچھا! تو گویا تم یہ جانتی ہو کہ کچھ پیا بھی جاتا ہے۔ میں نہ کہتا تھا کہ تم جنگل کا پھول ہو۔ تم واقعی جنگل کا پھول ہو۔ اگر پھول نہیں تو جنگل ضرور ہو۔ اور اگر جنگل بھی نہیں تو بیئر کی بند بوتل ضرور ہو۔"

"تو گویا آپ بیئر پی رہے ہیں۔ اچھا پھر خدا حافظ کل ملاقات ہو گی۔"

اس نے جلدی سے فون بند کر دیا۔ ریسیور میرے ہاتھ میں ہی رہ گیا۔ میں نے مسکرا کر سر جھٹکا اور ریسیور رکھ کر لان میں آ گیا۔ مسز جونس نے مسکرا کر شرارت سے میری طرف دیکھا۔

"ضرور تمہاری محبوبہ کا فون تھا۔"

میں نے ہنس کر کہا۔

"اجی ہمیں محبوبہ کہاں ملتی ہے۔ بس ایک واقف کار لڑکی تھی۔ کہہ رہی تھی سٹوڈیو دیکھنا ہے۔ میں نے کہا۔ کسی روز اطلاع کر کے آ جانا۔ بس۔"

مسٹر جونس نے کہا۔

"بالکل غلط بات۔ اتنی سی بات اتنی دیر میں؟ ضرور کوئی گڑبڑ ہے"۔

مسز جونس نے میرے چٹکی بھر لی۔

"تم لاکھ چھپاؤ وصی۔ میں سب کچھ جانتی ہوں۔"

سب لوگ زور سے ہنس پڑے اور بیئر کے گلاس پھر منہ در منہ بھر دیئے گئے۔ کانا عاشق دیسی شراب کا چھٹا پیگ اٹھا چکا تھا۔ اور اب آہستہ آہستہ اس کی گردن طوطے کی طرح ہلنا شروع ہو گئی تھی۔ مسٹر جونس نشے میں تھا۔ وہ بیئر کے کئی گلاس چڑھا چکا تھا۔ اور اب کبھی چٹکیاں بجا رہا تھا۔ اور کبھی رانوں پر ہاتھ مار کر کوئی انگریزی گانا گانے لگتا تھا۔ مسز جونس ذرا سنجیدہ ہو گئی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اسے اس بات سے دکھ ہو رہا ہے کہ میں ایک لڑکی سے عشق کر رہا ہوں۔ یا کوئی لڑکی مجھ سے عشق کرنے لگی ہے۔ ایک بار اس نے بڑی گہری نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور پھر ٹھنڈا سانس بھر کر بیئر کا گلاس چڑھا گئی۔ اس کے گال کا مسا نیلگوں ہو گیا تھا اور آنکھوں میں نشے کا دھند لکا چھا رہا تھا۔ میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اندر آ کر میں نے کپڑے بدلے۔ میرا نوکر ہوٹل سے کھانا لے آیا تھا۔ اس نے کھانا لگا دیا۔ میں نے کھانا کھایا اور سگریٹ سلگا کر باہر برآمدے میں آ کر آرام کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چل پڑے تھے۔ ہوا مرطوب تھی اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بس کوئی پل میں بارش ہونے لگے گی۔

اولمپس پیلس والوں کی منڈلی لان میں پیپتے کے درخت کے نیچے ابھی تک بیٹھی شراب

Murtaza A. Siddiqui
mascom4u@gmail.com
NOVELS URDU STORIES

پی رہی تھی۔ مسٹر جونس نے ٹانگیں میز پر بچھا رکھی تھیں۔ کا نے عاشق کی محبوبہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ اور اس کی گردن طوطے کی طرح ہل رہی تھی۔ مسز جونس نے مجھے دیکھا تو اٹھ کر میرے پاس آ گئی۔ اور ساتھ والی آرام کرسی پر آ کر نیم دراز ہو گئی۔ وہ ننگے پاؤں تھی اور ہاتھ میں سگریٹ سلگ رہا تھا۔ اور بالوں کا جوڑا گردن پر کس کر باندھا ہوا تھا۔ میں سرور میں تھا۔ دل صبح ثریا سے، ایک جوان صحت مند پنجابی لڑکی سے ملنے کے خیال سے مسرور تھا۔ اس وقت مجھے مسز جونس کا سنجیدہ چہرہ ایک آنکھ نہ بھایا۔ میں یونہی موسم کی بات کرنے لگا۔ مسز جونس نے اچانک کہا۔

"کیا تم مجھ سے خوش نہیں ہو؟"

میں نے پوچھا

"کس بات میں؟"

"کیا میں تمہیں خوش نہیں کر سکی؟ میں نے تو اپنا آپ تمہارے حوالے کر دیا تھا۔ میں نے تو اتنی محبت کبھی کسی سے نہیں کی جتنی تم سے کرتی ہوں۔ پھر تم دوسری لڑکیوں کے پیچھے مارے مارے کیوں پھر رہے ہو۔ اس لیے کہ میں خوبصورت نہیں ہوں۔ یا میں عمر میں تم سے بڑی ہوں؟ کاش! میں اپنی عمر ایک ہی رات میں سولہ سال کم کر سکتی۔ پھر تم مجھے چھوڑ کر کبھی نہ جاتے؟"

میں نے سوچا۔ لو یہ ایک نئی مصیبت کھڑی ہو گئی۔ اسے تو محبت کا بخار ہو گیا۔ یہ عورت کس غلط فہمی میں پھنس گئی۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

"مسز جونس! تم کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اول تو میں کسی لڑکی سے محبت نہیں کرتا۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تم ضرور محبت کرتے ہو۔ تمہاری آنکھیں کہہ رہی ہیں کہ تم محبت کرتے ہو۔ جب تم فون کر کے آ رہے تھے تو تمہارے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ تھی جو صرف محبت کرنے والوں کے ہونٹوں پر ہی ہوتی ہے۔ میں نے ایک زمانہ دیکھا ہے۔ میں بچی تو نہیں ہوں۔ خیر! تمہیں محبت کرنے کا حق ہے۔ میں تمہیں روک نہیں سکتی۔ لیکن اتنا ضرور کہہ دوں گی کہ جو محبت تمہیں مجھ سے ملے گی وہ تمہیں دنیا کی کوئی عورت نہیں دے سکتی۔ یہ کنواری چھوکریاں تو صرف بات بات پر شرمانا اور ہائے وائے کرنا ہی جانتی ہیں۔ انہیں کیا خبر کہ مرد کو محبت کا جواب کس طرح دیا جاتا ہے"۔

مسز جونس نے سگریٹ گھاس میں پھینک دیا۔ میں نے اپنا سگریٹ پیش کیا۔ اس نے چپکے سے لے لیا۔ اور اسے جلا کر بولی۔

"تم میری باتوں کو مذاق سمجھ رہے ہو گے۔ مگر میں نشے میں بات نہیں کر رہی۔ میں تم سے پورے ہوش و حواس میں ہمکلام ہوں۔ عورت تیس سال کے بعد جا کر پوری عورت بنتی ہے۔ اور میں چھتیسویں سال میں ہوں۔ میں عورت پنے کے عروج پر ہوں۔ میں تم پر عورت کے ایسے ایسے راز فاش کر سکتی ہوں کہ تم عمر بھر مجھے یاد کرتے رہو گے۔ میری زندگی میں کئی لوگ آئے اور چلے گئے۔ مگر تم ان سب سے پیارے ہو۔ اسی لیے میں تمہیں زیادہ پسند کرتی ہوں۔ بتاؤ کیا میں تمہیں بری لگتی ہوں؟"

میں نے کہا:

"میں یقیناً تمہیں پسند کرتا ہوں مسز جونس! تم بہت شاندار عورت ہو۔ تم ہمدرد ہو۔ رحم دل ہو اور سب سے بڑھ کر یہ دل کی انتہائی سادہ اور نیک ہو۔ بلکہ میں تو تمہاری بے حد عزت کرتا ہوں۔"

"بکواس ہے۔ مجھے عزت کی نہیں محبت کی ضرورت ہے۔ چاہے مجھے آوارہ اور حیا باختہ سمجھو مگر مجھ سے محبت کرو۔ میں محبت چاہتی ہوں۔ عزت نہیں۔ عزت میری کہیں بھی نہیں ہے اور نہ مجھے کبھی مل ہی سکتی ہے۔ عورت کی عزت جب ایک بار ہاتھ سے نکل جاتی ہے تو پھر کبھی لوٹ کر نہیں آتی۔ مجھے صرف اتنا بتادو۔ کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو یا نہیں ----- بس۔"

میں پریشان ہو گیا۔ میرا سارا نشہ غارت ہو گیا تھا۔ اس عورت نے مجھے عجیب امتحان میں ڈال دیا تھا۔ اگر صاف صاف بات کہتا ہوں تو اس کی دل شکنی ہوتی ہے۔ جھوٹ بولتا ہوں تو یہ ڈرد امن گیر ہے کہ کہیں یہ بلا سر پر ہی سوار نہ ہو جائے۔ آخر میں نے کہا۔

"تم سے کون محبت نہیں کرے گا مسز جونس! تم بلاشبہ بڑی اچھی عورت ہو۔"

مسز جونس نے سر جھٹک کر کہا۔

"مجھے کسی سے کوئی غرض نہیں۔ تم مجھے چاہتے ہو یا نہیں؟"

"ہاں! میں بھی چاہتا ہوں۔"

اس پر مسز جونس کی باچھیں کھل گئیں۔ اس کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ اگر سامنے

Murtaza A. Siddiqui
mascom4u@gmail.com
NOVELS URDU STORIES

لان میں اس کا خاوند اور وہ کانا عاشق نہ ہوتا تو وہ یقیناً میرا منہ چوم لیتی۔ پھر بھی اس نے میرا ہاتھ زور سے دبایا اور اٹھ کر لان میں چلی گئی۔ وہاں جا کر اس نے بیئر کا گلاس بھرا اور اسے لے کر میرے پاس آ گئی۔

"میری خوشی کی خاطر اس کا ایک گھونٹ پی جاؤ۔"

میں نے گلاس اس کے ہاتھ سے لے کر بیئر کا ایک گھونٹ پی لیا۔ اس کے بعد اس نے گلاس کو چوما اور غٹاغٹ ساری بیئر پی گئی۔ پھر جھک کر بولی۔

"تم نے مجھے بے حد خوشی دی ہے۔ میں بھی تمہیں بے حد خوشی دوں گی۔ تم جہاں بھی ہو گے۔ مجھے ضرور یاد کرو گے۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

اتنا کہہ کر وہ گلاس لیکر لان میں واپس آ گئی۔ میز پر گلاس رکھا۔ اپنے خاوند کا بوسہ لیا۔ کانے عاشق کے سر پر ایک ہلکی سی دھپ ماری اور مورنی کی طرح ناچتی میرے پاس برآمدے میں آ کر رک گئی۔ مجھ سے سگریٹ لیا۔ اسے جلانے کے لیے جھکی اور بولی۔

"ذرا میرے ساتھ آؤ۔"

پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتی ہوئی اپنے خاوند کی طرف دیکھ کر بولی۔

"میں مسٹر وصی کو کافی پلانے لگی ہوں۔ اگر تم لوگوں کو پینی ہو تو اندر آ جاؤ۔"

ہال کمرے میں جا کر وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ میں خوف زدہ ہو گیا۔ اور پچھتانے لگا کہ میں نے اپنے پاؤں پر کلہاڑا کیوں مار دیا۔ اس نے چٹ پٹ میرا منہ چوم لیا۔ میرے گال پر اسکے منہ سے بیئر کے بھپکے اڑنے لگے۔ اس نے نوعمر لڑکیوں کی طرح شرما کر کہا۔

"کل رات میں جونس کو باہر بھجوا رہی ہوں۔ بچے بھی اس کے ساتھ جائیں گے۔ بولو! اب تو خوش ہو ناں ۔۔۔۔۔ کل رات میں تمہیں بتاؤں گی کہ عورت کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ اور کہاں جا کر ختم ہوتی ہے۔"

میں تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اتنے میں باہر سے مسٹر جونس اور کانا عاشق "ہم بھی کافی پئیں گے" کی گردان کرتے اندر ہال کمرے میں آن پہنچے اور وہاں قہقہوں اور ہنسی مذاق کے طوفان میں کافی کا دور شروع ہو گیا۔ اس دوران مسز جونس بار بار مجھے دیکھ کر مسکراتی رہی اور میرے چٹکیاں بھرتی رہی اور میں خوف سے کانپتا رہا۔

9

گیارہ بجے کے قریب ثریا آ گئی۔

میں دفتر میں پروگرام ختم کرنے کے بعد کچھ خط دیکھ رہا تھا کہ وہ دفتر میں داخل ہوئی۔ میں نے گیٹ مین کانگڑی کو پہلے ہی کہہ رکھا تھا۔ ثریا نے ہلکے نیلے رنگ کی پھولدار کریپ کی قمیض اور سفید شلوار پہن رکھی تھی۔ گلے میں دوپٹہ پڑا تھا۔ پاؤں میں سرخ سینڈل تھی۔ اس کا رنگ نکھرا ہوا تھا اور ہونٹوں کے اوپر پسینے کی قطار چمک رہی تھی۔ آج گرمی تھی اور رات بھر کی بارش کے بعد پھر حبس ہو گیا تھا۔ دھوپ کبھی نکل آتی اور کبھی سورج بادلوں میں چھپ جاتا تھا۔ میں مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے ثریا کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ میں نے پوچھا۔

"کیا پیو گی؟ چائے یا ملک سکویش؟"

"جو آپ رات کو پی رہے تھے۔"

ثریا نے شرارت سے مسکرا کر کہا۔ میں خفیف سا ہو کر ہنس دیا۔ وہ اس لئے شاید بے تکلف ہو رہی تھی کہ رات میں بھی اس سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو گیا تھا۔ میں نے کہا۔

"رات میں تو چائے پی رہا تھا۔ کیا چائے منگواؤں؟"

ثریا ہنس پڑی اور اس کے سفید دانتوں کی لڑی جگمگا اٹھی۔

"چائے پی کر آدمی ایسی باتیں نہیں کرتا جیسی باتیں رات آپ فون پر کر رہے تھے؟"

اب میں کچھ فکر مند ہوا کہ جانے میں نے کیا باتیں کی تھیں۔ میں نے پوچھا۔

"میں نے بھلا کیا کہا تھا رات؟"

ثریا نے اپنا پرس میز پر رکھ کر مسکرا کر کہا۔

"آپ کہہ رہے تھے ثریا تم جنگل کا پھول ہو۔ تم جنگل ہو۔ تم جنگل میں منگل ہو۔ تم ماؤنٹ ایورسٹ ہو اور خدا جانے کیا کیا ہو۔۔۔۔۔"

وہ زور سے ہنس پڑی۔ میں بھی ہنس پڑا۔ دفتر کے دو ایک آدمیوں نے کنکھیوں سے ہماری طرف دیکھا اور زیر لب وہ بھی مسکرا دیئے۔ میں ثریا کو لے کر سٹوڈیو میں آ گیا۔ میں

Murtaza A. Siddiqui
murtaza.com4u@gmail.com
NOVELS URDU STORIES

نے اسے سارے سٹوڈیو دکھلائے۔ اسے بتایا کہ ریکارڈ کیسے بجائے جاتے ہیں ۔ فرمائشی پروگرام کہاں سے ہوتا ہے۔ ہماری آواز کیسے مائیکروفون سے ہو کر لوگوں کے ریڈیو سیٹ تک پہنچتی ہے۔ پھر میں نے اسے ساتھ والے کمرے میں ریکارڈوں کی لائبریری دکھلائی۔ اتنے سارے ریکارڈ دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ میں نے اس کا تعارف امریکی اناؤنسر مس کیٹی اور مدراسی اناؤنسر لڑکی سے کروایا۔ پورے بارہ بجے ہم دونوں دفتر کی عمارت سے باہر نکل آئے۔ میں نے اس سے کہا۔

"کیا تمہارے پاس کچھ فالتو وقت ہے؟"

"کس لئے؟"

ثریا نے مسکرا کر پوچھا۔ میں نے سگریٹ کی راکھ جھاڑ کر کہا۔

"میری خواہش ہے کہ ہم دونوں کسی جگہ بیٹھ کر اکٹھے کھانا کھائیں۔"

ثریا نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھ کر کہا۔

"بات دراصل یہ ہے کہ وصی صاحب کہ میں اپنی ایک سہیلی کے ہاں دعوت کا بہانہ کر کے گھر سے آئی ہوں۔"

میں نے خوش ہو کر کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارے پاس کافی وقت ہے۔ تم کم از کم پانچ بجے تک میرے پاس ٹھہر سکتی ہو۔"

"اوئی للہ! پانچ بجے تک تو شام ہو جائے گی۔ بس ایک آدھ گھنٹہ رک جاؤں گی۔ وہ بھی آپ کی خاطر۔"

ثریا نے شرما کر اتنا کہا اور درختوں کو دیکھنے لگی۔ میں نے سر جھکا کر شکریہ ادا کیا۔ اور کانگری سے کہا کہ ہمیں جیپ چاہیئے۔ کانگری سنہالی فوج کا حوالدار تھا اور اس کا منہ ہمیشہ پسینے سے بھرا ہوا رہتا تھا۔ اس نے کہا۔

"سر ٹولیو تھرٹین گیریزن گیا ہے۔ پندرہ بارہ ورکشاپ میں ہے۔ سولہ بیس میجر صاحب کو لے کر گئی ہے۔ تھوڑا ویٹ کرنا پڑے گا"۔

"کوئی بات نہیں مسٹر کانگری ہم ٹیکسی لے لے گا۔"

"سر ویری سوری! تھوڑا ویٹ کر لے گا تو ابھی گاڑی آجائے گا سر"۔

"تھینک یو مسٹر کانگری!"

میں ثریا کو ساتھ لے کر گیٹ سے باہر نکلا ہی تھا کہ سولہ بیس نمبر جیپ آ گئی۔ کانگری نے مجھے آواز دی۔ میں رک گیا۔ جیپ دروازے کے باہر ہی روک دی گئی۔ ہم دونوں جیپ میں سوار ہو گئے۔

"گال چلو۔"

ہماری فوجی جیپ کولمبو کی کشادہ اور خوبصورت سڑکوں پر فراٹے بھرتی گذرنے لگی۔ رات کی بارش نے سڑک کی دونوں جانب کھڑے درختوں کو دھو دھلا کر ہرا بھرا اور شاداب کر دیا تھا۔ سرخ پھولوں کے گچھے جا بجا درختوں میں لٹکے ہوئے تھے۔ ہماری جیپ مختلف سڑکوں پر سے ہوتی ہوئی گال روڈ پر آ گئی۔ ہوا میں ثریا کا دوپٹہ لہرا رہا تھا۔ رخساروں پر بالوں کی لٹ اڑ رہی تھی اور کریپ کی ریشمی قمیض بدن کے ساتھ چمٹ گئی تھی۔ یہ لڑکی اس رات سے زیادہ تر و تازہ اور شگفتہ ہو رہی تھی۔ اس شام کو جب وہ مجھے گل زیب کے گھر ملی تھی تو چہرے پر تھکن کے آثار تھے۔ لیکن آج تو وہ ایک ایسے پھول سے مشابہ تھی جس نے ساری رات شبنم میں غسل کیا ہو اور جس کی ہر پنکھڑی پر بہار کا نام لکھا ہو۔

فرسکو ریستوران کے باہر میں نے جیپ کھڑی کروادی ۔ گال روڈ پر فرسکو واحد ہوٹل تھا جس کی کشادہ گیلری میں پردہ دار بڑے خوبصورت کیبن بنے ہوئے تھے۔ میں قصداً اس ہوٹل میں آیا تھا کیونکہ میں ثریا سے عشق کرنا چاہتا تھا۔ میں نے جیپ رخصت کر دی اور ثریا کو اوپر گیلری والے کیبن میں لے آیا۔ یہاں بیٹھ کر ہم نے کھانا کھایا۔ کھانے پر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں اور ثریا مجھ سے کافی کھل گئی۔ کھانے کے بعد میں نے کافی منگوائی۔ یہاں کی کافی شہر بھر میں مشہور تھی۔ اس کافی کے ساتھ ناریل کے دودھ کی بجائے بھینس کا دودھ ملتا تھا۔ کیونکہ ناریل کے دودھ سے کافی کے فلیور کے بگڑ جانے کا خطرہ ہے۔ میں نے ثریا کے لیے بنائی وہ آہستہ آہستہ کافی پینے لگی۔ اور میں نے سگریٹ جلا کر تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ ثریا نے اپنے کپڑوں پر خس کا عطر مل رکھا تھا۔ کیبن والے تیز پنکھے کی ہوا میں خس کی خوشبو اڑتی جا رہی تھی۔ اور مجھے ثریا پر ایک ایسے جزیرے کا گمان ہو رہا تھا۔ جو ابھی دریافت نہ ہوا ہو۔ جو دور دراز کے گمنام سمندروں میں چھپا اپنے ساحل پر اترنے والوں کا انتظار کر رہا ہو۔ دوسرا احساس مجھے سوندھی سوندھی خوشبو اڑاتی مٹی کا ہوا، مٹی۔۔۔۔۔۔ جس

NOVELS URDU STORIES
Murtaza A. Siddiqui
masoodmu@gmail.com

کے سینے میں گلاب کے پھولوں کے بیج سو رہے ہوں اور خاص وقت پر زمین کا سینہ چیر کر باہر نکلنے کے منتظر ہوں۔"

ثریا نے مسکرا کر پوچھا۔

"کیا سو گئے آپ؟"

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ ثریا کا مسکراتا ہوا چہرہ میرے سامنے تھا۔

"تمہیں دیکھ کر تو سوتوں کی نیند اڑ جاتی ہے ثریا۔ میں کیسے سو سکتا ہوں۔ اور پھر یہ گھڑیاں پھر کہاں ملیں گی"۔

اس کے ساتھ ہی اپنی عادت سے مجبور ہو کر میں نے ثریا کا ہاتھ تھام لیا۔ ثریا نے آہستہ سے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ میں نے کھسیانا سا ہو کر کہا۔

"کیا مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے ثریا؟"

"جی ہاں۔"

"کیا؟"

ثریا نے ہنس کر کہا۔

"یہ ہماری دوسری ملاقات ہے"۔

میں نے مسکرا کر کہا۔

"محبت میں انسان سالوں کی مسافت دنوں بلکہ منٹوں میں طے کر جاتا ہے ثریا"۔

ثریا نے بڑی بڑی شرمگیں آنکھیں کھول کر پوچھا۔

"تو گویا آپ کو محبت ہو گئی ہے؟"

میں نے جھٹ کہا۔

"محبت تو مجھے اسی وقت ہو گئی تھی جب میں نے زیب کے گھر تمہیں پہلی بار دیکھا تھا۔ میرا دل تو اسی وقت دھڑکنے لگا تھا۔ جب پہلی بار تمہاری آواز میرے کانوں میں پڑی تھی اور تم نے مجھے پکارا تھا۔ اب تو یوں لگتا ہے جیسے میں مدت سے تمہیں جانتا ہوں"۔

ثریا میری طرف دیکھ کر بڑی شرارت سے مسکرائے جا رہی تھی۔ اس کی ٹھوڑی کا سیاہ تل کالے گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح کھلتا محسوس ہو رہا تھا۔ رخساروں پر کچھ حیا کی شوخی جھلکنے لگی تھی۔ وہ ہونٹ سکوڑ کر کافی بھی پیے جا رہی تھی۔ اور میری گفتگو بھی سن رہی تھی۔

"آپ کے خیال میں محبت کیا ہے مسٹر وصی؟"

ثریا کے سوال نے مجھے ایک دم پریشان سا کر دیا۔ میں نے آج تک کئی لڑکیوں سے محبت کی تھی۔ مگر یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ محبت کیا ہوتی ہے۔ میرا ذہن الٹ پلٹ سا گیا۔ لیکن ثریا کو بروقت جواب دینا بھی ضروری تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ میں نے سگریٹ بجھاتے ہوئے کہا۔

"محبت دو دلوں کے ملاپ کا نام ہے۔ محبت پھول کی خوشبو ہے۔ چاند کی چاندنی ہے۔ اور جنگلوں کی صبح ہے۔ محبت زندگی ہے اور زندگی محبت ہے۔۔۔۔۔۔۔۔"

ثریا نے میری بات کاٹ دی۔

"یہ تو آپ سستے ناولوں کے ہیروؤں ایسی باتیں کرنے لگے"۔

حقیقت یہ ہے کہ میں شرمسار ہو گیا۔ زندگی میں پہلی بار ایک لڑکی کے سامنے شرمندہ ہو گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ یہ سستے ناولوں کی باتیں تھیں۔ اور میں نے محبت کی اس قسم کی تعریف کو کسی گھٹیا ناول میں ہی پڑھا تھا۔ اب کیا کیا جائے۔ لڑکیوں کے سامنے محبت کی کچھ ایسی ہی تعریف کی جاتی ہے۔ کیونکہ لڑکیاں اس قسم کی مہمل اور لایعنی باتوں سے خوش ہوتی ہیں۔ لیکن معلوم ہو رہا تھا کہ ثریا اس قسم کی لڑکی نہیں تھی۔ اس نے پھر کہا۔

"محبت کی صحیح تعریف آپ کے نزدیک کیا ہے۔ یعنی آپ دلی طور پر اس جذبے کو کیسے ذہن میں لاتے ہیں اور کیونکر اسے سمجھتے ہیں"۔

میں نے سوچا یہاں بے معنی باتوں سے دال نہیں گلے گی۔ یہ لڑکی حقیقت پسند معلوم ہوتی ہے۔ اس سے حقیقت پسندی سے کام لینا چاہیئے۔ میں نے نیا سگریٹ سلگا کر کہا۔

"کیا تم مجھے یقین دلا سکتی ہو کہ محبت کی صحیح تعریف سن کر تم یہاں سے اٹھ کر چلی نہیں جاؤ گی؟"

"بالکل یقین دلاتی ہوں"۔

ثریا نے مسکرا کر کہا۔ وہ برابر مسکرائے جا رہی تھی اور اس کی مسکراہٹ میں شرارت اور شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"تو سنو! میرے خیال میں محبت جوان عورت اور جوان مرد کے صحت مند جسموں کی کشش کا نام ہے۔ یہ ایک نامحرم عورت اور ایک نامحرم مرد کے درمیان سمجھوتہ ہے کہ ہم کچھ

NOVELS URDU STORIES
Murtaza Siddiqui
masoom4u@gmail.com

وقت ایک دوسرے سے مل جل کر گذاریں گے۔ اور اس کے بعد ایک دوسرے کو بھول جائیں گے۔ بلکہ اگر ہو سکا تو نفرت بھی کرنے لگیں گے"۔

ثریا کو شاید میرے منہ سے اس قسم کے جواب کی توقع نہ تھی۔ وہ کچھ حیران سی ہو گئی۔ اور اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اسے کچھ اس قسم کا خیال تھا کہ میں اسے کہوں گا کہ محبت ایک سچا جذبہ ہے اور یہ زندگی میں صرف ایک بار کی جاتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔۔۔لیکن میرے منہ سے ایسی بے باک وضاحت سن کر وہ کچھ پریشان سی ہو گئی۔

اس نے پلکیں جھپکا کر کہا۔

"اس طرح تو دنیا کی ہر عورت سے ہر مرد محبت کر سکتا ہے۔ یہ تو محبت کی توہین ہے۔ میں ایسا نہیں سمجھتی"۔

میں نے کہا۔

"تمہیں اس سے اختلاف ہو سکتا ہے ثریا! لیکن حقیقت یہی ہے جو میں نے بیان کر دی ہے۔ کم از کم میرے خیال میں تو ایسا ہی ہے"۔

"کیا آپ کے خیال میں انسان زندگی میں صرف ایک بار محبت نہیں کرتا؟"

"میں ایسے آدمی کو کنوئیں کا مینڈک سمجھتا ہوں۔ وہ قدرت کی عطا کی ہوئی نعمتوں کا مذاق اڑاتا ہے۔ دنیا اتنی محدود نہیں ہے کہ یہاں صرف ایک ہی شے سے زندگی میں ایک ہی بار پیار کیا جائے۔ یہاں تو محبت کرنے والی اتنی چیزیں ہیں کہ اس کے لیے وہ ہزار برس کی عمر بھی کم ہو گی"۔

ثریا ہنس پڑی۔ وہ سمجھ گئی کہ میں مذاق کر رہا ہوں۔

"آپ بقول زیب کے رومانٹک ہو رہے ہیں"۔

میں نے ثریا کا ہاتھ چوم کر کہا۔

"میں صرف تمہارے سامنے رومانٹک ہو رہا ہوں۔"

ثریا نے گھبرا کر ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ اس کے رخساروں پر حیا کی سرخی دوڑ گئی اور اس نے نظریں جھکا لیں۔ میں نے اس خاموشی کو نیم رضامندی پر محمول کرتے ہوئے مزید جرأت سے کام لیا اور اپنے دونوں ہاتھوں میں ثریا کا خوبصورت گول چہرہ تھام لیا۔

"ثریا! محبت ایک ناقابل فہم ایک ناقابل اعتبار جذبہ ہے۔ ہم نہ تو اس جذبے کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ اس پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔ ہم ایک لڑکی کو اچانک اپنے سامنے دیکھتے ہیں اور اس کے لیے تڑپنے لگتے ہیں۔ اس کو زیادہ سے زیادہ اپنے قریب دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کو سینے سے لگا کر ساری عمر پیار کرتے رہنا چاہتے ہیں۔ لیکن پھر اچانک ایسا ہوتا ہے کہ ہم اس کی صورت تک سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ کل جس کے انتظار میں ہم گھڑیاں گنا کرتے تھے آج اس سے پہلو بچا کر گذر جاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ہم اسے بالکل نہیں سمجھ سکتے۔ ان تمام باتوں کے باوجود حسن ایک سچائی ہے جو ہر حالت میں ہر مقام پر انسان کو متاثر کرتی ہے اور متاثر کرتی رہے گی"۔

ثریا نے اپنا چہرہ پیچھے کر لیا اور آہستہ سے کہا۔

"اس کے باوجود آپ محبت کرتے ہیں"۔

میں نے کہا۔

"ہاں ثریا! اس کے باوجود ہم محبت کرنے پر مجبور ہیں۔ اگر ایسا نہ کریں تو زندگی کے اس جہنم میں ایک پل کے لیے بھی زندہ نہ رہ سکیں۔ یہاں رہنے کے لیے ہمیں یہ زہر کھانا ہی پڑتا ہے۔ یہ سانپ کٹوانا ہی پڑتا ہے"۔

ثریا نے گہری سوچ میں ڈوب کر پوچھا۔

"محبت میں اگر شادی ہو جائے تو آپ کے خیال میں اس طرح محبت غیر فانی نہیں ہو جاتی؟"

میں نے نیا سگریٹ سلگا کر کہا۔

"بلکہ وقت سے پہلے مر جاتی ہے۔ شادی سے پہلے وہ زیادہ دیر تک زندہ رہ سکتی ہے۔ مگر شادی کے بعد وہ دوسرے ہی روز اللہ کو پیاری ہو جاتی ہے۔ شادی سے پہلے ہم محبت کو ایک کنجوس کی طرح پائی پائی کر کے خرچ کرتے ہیں۔ اور شادی کے بعد ہم اسے دو ہی دنوں میں خرچ کر کے خالی ہاتھ ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ شادی محبت کی دشمن ہے۔ محبت کے بغیر شادی کے کامیاب ہونے کی نوے فی صد اُمید ہوتی ہے۔ لیکن محبت کی شادی ہر حالت میں ناکام ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ محبت کرنے والے اتنے ذمہ دار ہوں کہ جگ ہنسائی یا اپنی محبت کو بدنامی کی ذلت سے بچانے کے لیے اس گاڑی کو کسی نہ کسی طرح کھینچتے چلے

NOVELS URDU STORIES
Murtaza A Siddiqui
masood4u@gmail.com

جاتے ہیں۔

ثریا نے کہا۔

"لیکن میں ایک ایسی عورت کو جانتی ہوں، جس نے محبت کی شادی کی تھی۔ اس کی شادی کو دس سال ہو گئے دونوں میاں بیوی بڑے خوش و خرم رہتے ہیں۔ ان کی آپس میں کبھی لڑائی نہیں ہوئی"۔

میں نے کہا۔

"پھر انہوں نے یقیناً شادی کے بعد محبت کرنی شروع کی ہو گی۔ شادی کے بعد اگر محبت ہو جائے تو وہ موت کے بعد بھی زندہ رہتی ہے۔ مگر شادی سے پہلے کی محبت شادی کے بعد زندہ نہیں رہ سکتی۔ شادی شدہ اور ٹھیٹھ محبت کی توہین ہے اور کوئی بھی صحیح انسان اپنی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔ محبت ایک آزاد اور خود مختار جذبہ ہے۔ اسے کسی بھی بندھن میں بند کر دو سلاخیں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ میں بھی اسی سچے اور آزاد جذبے کے ساتھ تم سے محبت کرتا ہوں ثریا"۔

ثریا نے خاموش اور گہری قسم کی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور آہستہ سے بولی۔

"لیکن میں ایک لڑکے کو اپنا دل دے چکی ہوں"۔

کیبن میں خاموشی طاری ہو گئی۔ اب وہاں سوائے پنکھے کی آواز کے اور نیچے سے آنے والی لوگوں کی ہلکی ہلکی آوازوں کے اور کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ ثریا نے گویا ایک ایسا بم چلا دیا تھا جس نے وقتی طور پر ایک زبردست دھماکہ پیدا کرنے کے بعد فضا میں گہرا سناٹا طاری کر دیا تھا۔ تو کیا یہ لڑکی کسی دوسرے سے محبت کر رہی ہے۔ بڑی بری بات ہو گئی۔ میں نے بظاہر بڑی اداس آواز میں پوچھا۔

"کون ہے وہ؟"

ثریا نے سر جھکا کر کہا۔

"گوجرانوالہ میں رہتا ہے۔ شاید ہماری منگنی بھی ہو جائے۔ وہ ہمارا رشتے دار ہے۔ گھر والے وہاں میرا بیاہ کرنے پر راضی ہو گئے ہیں"۔

میں نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسل کر کہا۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ تم اس لڑکے سے محبت کرتی ہو ثریا؟"

ثریا نے جلدی سے کہا۔

"میں تو اسے ہر روز ایک خط لکھتی ہوں اور وہ بھی مجھے خط لکھتا رہتا ہے۔ میں اگلے ماہ یہاں سے گھر واپس جاؤں گی تو وہ سٹیشن پر میرا انتظار کر رہا ہو گا۔ ہمیں ایک دوسرے سے بہت زیادہ پیار ہے اور اتنا پیار کہ ہمیں خود بھی اس کا اندازہ نہیں"۔

میں نے سر جھٹک کر کہا۔

"ثریا! یہ جان کر بھی کہ تم کسی لڑکے سے پیار کرتی ہو میں بدستور تم سے محبت کرتا ہوں اور محبت کرتا رہوں گا۔ اس لیے کہ محبت میں محبت کرنے والے کے رشتہ داروں سے بھی پیار ہو جاتا ہے۔ مجھے تو اس لڑکے سے بھی محبت ہو گئی ہے۔ میں تمہیں ہمیشہ سکھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں یہ کبھی گوارا نہیں کر سکتا کہ وہ چیز چھین لوں جسے تم پیار کرتی ہو۔ اور جسے تم اپنا دل دے چکی ہو۔ مجھے تم اپنا دل بھی نہ دو تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ میرے نزدیک کوئی بھی انسان کسی دوسرے کو اپنا دل دے کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ مجھے دنیا کی کسی دوسری چیز سے سروکار نہیں۔ میں تم سے سدا پیار کرتا رہوں گا"۔

ثریا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کو میری من گھڑت بے معنی باتوں نے بڑا متاثر کیا۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا۔ میں نے رومال سے اس کے آنسو پونچھے۔ اس نے اپنا سر میرے کندھے سے لگا دیا۔ میرا نشانہ ٹھیک رہا تھا۔ درخت کی سب سے اونچی شاخ پر لگی ہوئی انجیر ٹوٹ کر میری جھولی میں آن گری تھی۔ میں نے ثریا کا آنسوؤں بھرا چہرا ہاتھوں سے اوپر اٹھایا اور اس کے کانپتے ہوئے شہد آگیں ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ واقعی گوجرانوالہ کے خربوزے بے حد شیریں تھے۔ ان ہونٹوں میں ان جنگلی پھولوں کی خوشبو اور مٹھاس تھی جو پہاڑیوں کی اوٹ میں اُگتے ہیں اور جن کی کسی کو خبر نہیں ہوتی۔ ثریا نے صرف اس لیے اپنا آپ میرے حوالے کر دیا تھا کہ میں اس کے محبوب سے محبت کرتا تھا۔ شاید وہ مجھے بھی اپنا محبوب سمجھنے لگی تھی۔ عورتیں انتہائی مکار ہونے کے باوجود انتہائی معصوم اور نہتی ہوتی ہیں۔ آدمی ذرا ہوشیار ہو تو وہ پہلے ہی وار میں چاروں شانے چت زمین پر گر پڑتی ہیں۔ میں ثریا سے لپٹا اس کا منہ چومتا رہا۔ اس کے ہونٹوں سے بڑی گہری اور میٹھی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ اس کا سارا صحت مند بھرا بھرا کسا کسایا کانپتا ہوا گرم گرم بدن خس کی

NOVELS UIRDU STORIES
Murtaza A. Siddiqui
murtaza4u@gmail.com

خوشبو دے رہا تھا۔ جس میں اس کے پسینے کی بُو مخلوط ہو رہی تھی۔ مجھے وہم گمان میں بھی نہ تھا کہ میں اتنی جلدی اس مہم کو سر کر لوں گا۔ میں وقت سے پہلے کامیاب ہو جانے کی خوشی میں سرشار تھا اور ثریا کے سارے جسم کو پیار کر رہا تھا۔ اور بار بار اس کا اور اپنی محبت کا ذکر کر رہا تھا۔ میں اسے کہہ رہا تھا۔

"میری محبت ان ساری باتوں سے بلند ہے ثریا! میں تمہیں اپنے محبوب کے ساتھ خوش دیکھ کر بے حد خوش ہوں گا۔ بلکہ میں تمہاری شادی میں شریک ہونے یہاں سے تمہارے شہر جانے کو تیار ہوں۔ خدا کرے کہ تم دونوں ہنسی خوشی زندگی بسر کرو۔ میرے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی خوشی کی بات نہیں ہو گی۔ کہ میں تم دونوں کو ہنستا مسکراتا دیکھوں۔ میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں بھی تمہاری پوجا کرتا ہوں۔ اور میں ہمیشہ تم سے محبت کرتا رہوں گا۔ دل کے تنہا مندر میں اکیلا بیٹھا تمہاری پوجا کرتا رہوں گا"۔

ثریا منہ سے کچھ نہیں بول رہی تھی۔ بس وہ مجھ سے لپٹتی جا رہی تھی۔ اس کے آنسو خشک ہو گئے تھے اور سانس تیز تیز چل رہا تھا۔ جسم گرم ہو گیا تھا۔ کان سرخ ہو گئے تھے۔ اور ہونٹوں پر خشک ہوا چلنے لگی تھی۔ مجھے سیر ھیوں پر کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ ہم جلدی سے الگ ہو گئے۔ بیرا بل لے کر اند آ گیا۔ میں نے بل ادا کر دیا۔ میں نے ثریا سے پوچھا۔

"ثریا آئس کریم منگواؤں؟"

ثریا کا دم پھولا ہوا تھا۔ اس نے سر ہلا کر نہیں کہا۔ بیرا چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم بھی فرسکو ہوٹل کے کیبن سے نکل کر سڑک پر آ گئے۔ دھوپ خوب نکلی ہوئی تھی۔ اور بادلوں کا آسمان پر نام و نشان تک نہیں تھا۔ گہرے نیلے آسمان پر سورج چمک رہا تھا اور گرمی کے مارے لوگوں کا برا حال ہو رہا تھا۔ کیونکہ ہوا بدستور بند تھی۔ ابھی دو ہی بجے تھے۔ میں ثریا کو لے کر سمندر کے کنارے لیونیا کلب کے عقبی ناریل کے ذخیروں میں آ گیا۔ یہاں ناریلوں کے گھنے جھنڈ تھے۔ ایک طرف سمندر کی موجیں ساحل کے پتھروں سے ٹکرا رہی تھیں اور دوسری طرف ناریلوں کا جنگل حدِ نگاہ تک چلا گیا تھا۔ یہ جنگل گال روڈ کے ساتھ کولمبو کے جزیرے کے ساتھ ساتھ جاتا تھا۔ یہاں کہیں کہیں بانس کی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہ جھونپڑیاں ان لوگوں نے بنوا رکھی تھیں۔ جو چاندنی راتوں میں اپنے دوستوں کے ساتھ یہاں

آ کر دادِ عیش دیتے تھے۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ جسم ٹوٹ رہا تھا اور رگ رگ میں ایک پُر گرم تھکن سی سرائت کر گئی تھی۔ ثریا میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اس کے صحت مند بھرے بھرے گداز اور سخت جسم کی گرمی سے میرا سانس جل رہا تھا۔ جھونپڑیاں درختوں کے جھنڈوں میں ویران پڑی تھیں۔ وہاں کوئی متنفس نہ تھا۔ کیونکہ گرمی اور حبس بے حد ہو رہا تھا۔ ثریا پسینے میں شرابور تھی اور بار بار رومال سے منہ پونچھ رہی تھی۔ اس کی بغل میں بھی پسینے نے قمیض کو گیلا کر دیا تھا۔ چلتے چلتے ہم ساحل سمندر پر ناریل کے درختوں میں کافی دور نکل گئے۔ ہمارے عقب میں چٹانیں آ گئیں جن کے پتھروں سے سمندر کی موجیں ٹکرا کر شور پیدا کر رہی تھیں۔ یہاں ہوا چلنے لگی اور ہماری جان میں جان آئی۔ میں نے ثریا کا بازو تھام کر کہا۔

"میری جان! معلوم ہوتا ہے تم تھک گئی ہو۔ آؤ ذرا یہاں آرام کر لیں"۔

ثریا کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے اور اس کا سانس ابھی تک درست نہ ہوا تھا۔ اس نے میری طرف عجیب پُراسرار نگاہوں سے دیکھا اور کوئی جواب نہ دیا۔ میں اسے لے کر ناریل کے درختوں کے بیچ میں کھڑی ایک بانس کی ویران جھونپڑی کے دروازے پر آ گیا۔ ہم دونوں اس جھونپڑی میں داخل ہو گئے۔

"کیسی پر سکون جگہ ہے۔ کاش ہم ساری عمر اسی جگہ بسر کر سکیں۔ انسان کو سوائے ایک جھونپڑی اور خوبصورت عورت کے قرب کے اور کیا چاہیئے؟" کم از کم مجھے کچھ درکار نہیں۔ یہ سمندر، ناریلوں کا جنگل، بانس کی پر سکون جھونپڑی اور خوبصورت ثریا۔۔۔۔۔۔۔۔ جس کی میں پوجا کرتا ہوں۔ بھلا اس سے زیادہ مجھے اور کیا چاہیئے؟ کیوں ثریا؟"

ثریا کچھ گھبرائی ہوئی سی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کنکھیوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میری نظریں اٹھتے ہی اس نے آنکھیں جھکا لیں اور ذرا سا مسکرا کر بولی۔

"یہ تو بڑی چپ چاپ جگہ ہے"۔

میں نے ثریا کا ہاتھ پکڑ کر اپنے دل پر رکھ لیا۔

"آج سے یہ دل تمہارے قدموں پر ہے ثریا۔ تم اسے ٹھکرا دو۔ یا اٹھا کر اپنے سینے میں رکھ لو۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا"۔

NOVELS UURDU STORIES
Murtaza A. Siddiqui
murtaza4u@gmail.com

ثریا تیز تیز سانس لینے لگی۔ بار بار ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔ اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔

"خدا کے لیے ایسا نہ کہیں میں کسی کا دل نہیں ٹھکرا سکتی"۔

"میری ثریا"۔

میں نے ثریا کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ میرے ہونٹ ثریا کے ہونٹوں پر تھے اور باہر سمندر کی لہروں کا شور اٹھ رہا تھا۔ ہوا ناریل کے درختوں میں سے سرسراتی گذر رہی تھی۔ جھونپڑی کا دروازہ نصف بند تھا۔ پچھلی کھڑکی کا ایک پٹ کھلا تھا۔ زمین پر ناریل کی چھال بچھی ہوئی تھی۔ ناریل کا جنگل ویران اور سنسان تھا۔ گرم دوپہر میں وہاں جانور بھی کوئی نہیں بول رہا تھا۔ میں نے ثریا کو ناریل کی چھال پر بٹھلالیا۔ وہ نیم دلی سے میرے ہاتھ کو اپنی قمیض میں سے باہر نکالنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

"نہیں نہیں وصی ایسا نہ کریں۔ میں ایسی لڑکی نہیں ہوں۔ خدا کے لیے ایسا نہ کریں۔ میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ ضرور محبت کرتی ہوں۔ مگر محبت کا مطلب یہ نہیں۔ نہیں نہیں۔ خدا کے لیے محبت یہ نہیں ہوتی۔۔۔۔۔"

لیکن محبت اس کے بغیر اور کیا ہوتی ہے پھر؟ اگر محبت میں سے عورت کا خوبصورت سینہ، سڈول کولہے، رس بھرے ہونٹ اور بھرے بھرے بازو نکال دیں تو اس میں باقی کیا رہ جائے گا۔ کیا ہم کسی ایسی عورت سے محبت کر سکتے ہیں جو ہڈیوں کا ڈھیر ہو اور جس کے زخموں پر مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں۔ ہم اس سے ہمدردی کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے ہسپتال سے دوائی لاتے ہوئے اپنی جان کی بازی لگا سکتے ہیں۔ لیکن اس کا منہ نہیں چوم سکتے۔ اس سے بغلگیر نہیں ہو سکتے۔ اس سے محبت نہیں کر سکتے۔ محبت ایک خالص جنسی جذبہ ہے۔ جو غیر خوبصورت سہی مگر صحت مند جوان عورت کا طلبگار ہے۔ محبت میں جسم ہی سب کچھ ہے۔ اگر جسم نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ ہم اس کے بغیر روح کا تصور بھی قائم نہیں کر سکتے۔ یہی ہم سے محبت میں ٹھنڈی آہیں بھرواتا ہے۔ یہی ہم سے پہاڑ کاٹ کر ندی نکلواتا ہے۔ یہی لیلیٰ کے کتوں کو پیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہی ہمیں دردانگیز یادوں کے خزانے دیتا ہے اور یہی ہمیں آخر حسنِ حقیقی کے اس دروازے میں داخل کرواتا ہے جس کے اندر یہ خود قدم بھی نہیں رکھ سکتا۔ میں نے ثریا کو اپنے ساتھ لگا رہا تھا اور اس کے جسم

کے نشیب و فراز میں سے ہوتا ہوا حسن حقیقی کی جستجو میں سرگرداں تھا۔ ثریا بے سدھ ہو کر پڑی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ہونٹ کھلے تھے اور سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ میں نے اس کا سینہ چوم کر کہا۔

"ثریا! تم ناریل کے جنگل کی وہ گرم ہوا ہو جو عین دوپہر کو سمندر سے ہو کر چلا کرتی ہے۔ اس ہوا میں ناریل کے تنوں کی گرم بُو رچی ہوئی ہے۔ تم سمندر کی موج کا وہ پانی ہو جو ساحل پر آ کر زمین میں جذب ہو جاتا ہے۔ اور پھر کبھی لوٹ کر سمندر کی طرف نہیں جاتا۔ تم ناریل میں چھپا ہوا سفید بے داغ ان چھوا پھول ہو۔ تمہاری خوشبو آج تک کسی نے محسوس نہیں کی۔ تمہارے نازک لبوں کی حلاوت سے کسی کے ہونٹ آشنا نہیں ہوئے۔ تمہارے جسم کی گرمی میں گرم سمندروں کی مرطوب خوشبو ہے۔ تم واقعی ناریل کی دیوی ہو۔ ناریل کے گھنے جنگل کی دیوی ہو۔ جو گرم دوپہروں کو کھردری چھال کا لباس پہنے نیم عریاں حالت میں گھنے جھنڈوں میں سے جھانک کر دکھائی کرتی ہے"۔

ثریا خاموش تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ہونٹ نیم وا تھے۔ اور وہ ناریل کی چھال پر جھونپڑی کے نیم اندھیرے میں بے سدھ پڑی تھی۔ پھر سمندر کی طرف آنے والی موجوں کا شور زیادہ بھیانک ہو گیا۔ ناریل کے درختوں میں چلنے والی دھیمی ہوا کے جھونکے شوریدہ سر ہو کر چیخنے چلانے لگے۔ سورج زیادہ گرم ہو گیا۔ دھوپ زیادہ جلنے لگی۔ ساری جھونپڑی پسینے میں شرابور ہو گئی۔ اور پھر چاروں طرف مندروں کی گھنٹیاں سی بج اٹھیں۔۔۔۔۔۔ جس وقت ہم سمندر کے ساتھ ساتھ واپس آ رہے تھے۔ آسمان پر بادلوں کے قافلے جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ثریا کا سر جھکا ہوا تھا۔ کریب کی قمیض جگہ جگہ سے مسلی ہوئی تھی۔ اور وہ گہری سوچ میں ڈوبی چپ چاپ چلی جا رہی تھی۔ میں نے بڑی محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر چوم لیا۔ ثریا نے ذرا سا مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ ہوا تیز ہو گئی۔ اور ہلکی ہلکی بوندا بوندی شروع ہو گئی۔ ہم نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیا اور لیونیا کلب کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔

بارش تیز ہو گئی۔ جس وقت ہم ہنستے مسکراتے قہقہے لگاتے لیونیا کلب کے برآمدے میں پہنچے ہم بارش میں بھیگ چکے تھے۔ ثریا کے بال ماتھے پر چپک گئے تھے اور ریشمی قمیض گیلی ہو کر اس کے جسم سے چمٹ گئی تھی۔

NOVELS URDU STORIES Murtaza A. Siddiqui murcom4u@gmail.com

10

اس رات مسز جونس نے واقعی اپنے خاوند اور بچوں کو گھر سے باہر بھیج دیا تھا۔

میں اولمس پیلس میں شام کو آیا تو وہ لان میں کوٹھی کی دیوار کے پاس کھڑی ملازمہ سے پھولوں کا گلدستہ بنوا رہی تھی۔ آج اس نے نہا دھو کر اُجلے کپڑے پہن رکھے تھے اور بالوں کا جوڑا بڑا کس کر بندھا ہوا تھا۔ جس میں چمبے کی کلیاں سج رہی تھیں۔ اس کی سج دھج نرالی تھی۔ وہ کوئی تیس سال کی جوان عورت معلوم ہو رہی تھی۔ ہونٹوں پر اس نے خلافِ معمول تھوڑی تھوڑی سرخی جما رکھی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ میرے قتل کا سارا سامان ہو چکا ہے۔ مجھے کوٹھی میں داخل ہوتا دیکھ کر وہ خوشی سے جھوم اٹھی۔ مسکرا کر بولی۔

"مسٹر وصی! میں پھولوں کا گلدستہ بنا رہی ہوں۔ تمہیں پھول پسند ہیں کیا؟"

میں نے اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"ضرور پسند ہیں میڈم!"

مجھے اس زبردست قسم مردار عورت سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن آج میں بچ کر کہیں نہیں جا سکتا تھا۔ میری حالت اس بکرے کی سی تھی جسے رات کو ذبح کیا جا رہا ہو۔ میں نے کمرے میں جا کر غسل کیا۔ قمیض پاجامہ پہنا اور برآمدے میں بیٹھ کر شام کا اخبار پڑھنے لگا۔ مسز جونس ہال کمرے میں ادھر ادھر گھوم پھر رہی تھی اور خادمہ کے ساتھ مل کر خوابگاہ کی صفائی کروا رہی تھی۔ میں نے جھانک کر ہال کمرے میں دیکھا۔ کھانے والی میز کے عین بیچ میں پھولوں سے بھرا ہوا گلدان رکھا تھا۔ اور الماریوں کے شیشے چمک رہے تھے۔ شام آہستہ آہستہ گہری ہو رہی تھی۔ اور آسمان پر بادل پوری طرح چھا گئے تھے۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں ثریا کے ساتھ ساحل سمندر پر ناریل کے جنگل میں گذاری ہوئی گرم دوپہر کے خیال میں مگن تھا کہ مسز جونس میرے قریب آ کر بولیں۔ میں نے ان لوگوں کو آنٹی کے ہاں بھجوا دیا ہے۔ وہ کئی روز سے بیمار تھی۔ میں نے جونس سے کہا تم اس کی خبر لینے کیوں نہیں جاتے۔ ہر کام کے لیے میں ہی رہ گئی ہوں۔ بچوں کو لے کر وہاں جاؤ اور رات وہیں گذارو۔ آخر وہ کیا کہے گی"۔

پھر وہ ہنس پڑی اور ہاتھ پر ہاتھ مار کر بولی۔

"دیکھا میں نے اس مردود کو کیسا چلتا کیا۔ ارے وہ تو میری جان کا دشمن ہو گیا ہے۔ جب دیکھو سر پر موجود رہتا ہے"۔

میں نے اخبار پر نظریں گاڑے ہوئے کہا۔

"اور اگر وہ بال بچوں سمیت رات کو آ گیا تو؟"

مسز جونس قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ اس کے قہقہے نے میرے سارے جسم کو اس کی طرف متوجہ کر دیا۔

"آنٹی یہاں سے ستر میل کے فاصلے پر رہتی ہے۔ اور وہاں شام کے بعد کوئی ریل گاڑی اور بس کو لمبو نہیں آتی"۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد ہم دونوں برآمدے میں بیٹھے بیئر پی رہے تھے۔

مسز جونس کا خیال تھا کہ شراب اسے نقصان دیتی ہے۔ اس لیے بیئر پی جانی چاہیئے۔ لیکن میں بیئر میں سکاچ ملا کر پی رہا تھا۔ کیونکہ اس مرطوب موسم میں بیئر پی پی کر میرا پیٹ خراب ہو گیا تھا۔ ہمیں وہاں بیٹھے تھوڑا ہی عرصہ گذرا تھا کہ کانا عاشق اپنی بطخ نما محبوبہ کے ساتھ آ گیا۔ مسز جونس کے چہرے پر میں نے اس شخص کی آمد پر پہلی بار نفرت کے آثار دیکھے۔ لیکن اس وقت وہ ان دونوں کا خیر مقدم کرنے پر مجبور تھی۔ کانے عاشق نے آتے ہی مسٹر جونس کا پوچھا جب اسے معلوم ہوا کہ وہ آنٹی کی خبر لینے بچوں کے ساتھ گیا ہے تو اس نے اپنی اکلوتی آنکھ سے بڑے مشتبہ انداز میں میری طرف دیکھا اور جیب سے دیسی شراب کی آدھی بوتل نکال کر میز پر رکھ دی۔

"میں اپنا راشن لے آیا ہوں"۔

مسز جونس نے نفرت سے ناک سکوڑ کر کہا۔

"ظاہر ہے تم اپنا راشن لے کر ہی چلتے ہو"۔

پھر وہ بطخ محبوبہ سے باتیں کرنے لگ گئی۔ کانا عاشق دیسی شراب کی بوتل کھولنے لگا۔ بوتل کھول کر اس نے اپنی محبوبہ سے پوچھا۔ بطخ نے پینے سے معذوری ظاہر کی۔ مسز جونس نے کہا۔

"تم اسے دیسی ٹھرا پلا پلا کر مارنا چاہتے ہو کیا؟ تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ میں

NOVELS URDU STORIES
Murtaza A. Siddiqui
mascom4u@gmail.com

اسے بیئر پلاؤں گی"۔

"نو تھینکس آنٹی"۔

"کوئی بات نہیں"۔

اور مسز جونس نے ایک گلاس میں بیئر ڈال کر کانے عاشق کی محبوبہ کے سامنے رکھ دیا۔ کانا عاشق مسکرایا۔ اور مزید بدصورت ہو گیا۔ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے شراب کا پہلا جام حلق کے اندر ڈال لیا۔ اس کی محبوبہ آہستہ آہستہ بیئر پینے لگی۔ کوئی گھنٹہ بعد سب کو نشہ چڑھ گیا تھا۔ بطخ محبوبہ نے لالچ میں آ کر تین گلاس بیئر پی لی تھی اور اب اس کا سر گردن پر نہیں ٹھہر رہا تھا۔ کانا عاشق نصف بوتل ختم کر چکا تھا اور طوطے کی طرح گردن مار رہا تھا۔ اس نے کئی بار اپنی محبوبہ کے بوسے لئے۔ بطخ بار بار منہ اٹھاتی۔ کانا عاشق پٹاخ سے ایک بوسہ جڑ دیتا۔ دونوں مسکراتے اور پھر شراب پینا شروع کر دیتے۔ مسز جونس کو ان دونوں پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ وہ انہیں کھانے سے پہلے ہی چلتا کر دینا چاہتی تھی۔ مگر اسے بہانہ نہیں مل رہا تھا۔ آخر وہ اٹھ کر بولی۔

"اچھا بھئی میں سونے چلی۔"

کانے عاشق نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

"کیا آج کھانا نہیں کھاؤ گی؟"

مسز جونس نے غصے سے کہا۔ "نہیں۔"

اور اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں اٹھے۔ مجھ سے ہاتھ ملایا اور ایک دوسرے کو سہارا دیئے ایک دوسرے کر کندھوں پر سر رکھے کوٹھی کے دروازے سے باہر نکل گئے۔ مسز جونس نے برآمدے میں کھڑے ہو کر ان دونوں کو سڑک پر جاتے دیکھا اور بولی۔ "یہ لوگ ہمیشہ میرا پروگرام خراب کرتے ہیں۔"

پھر میرے پاس آ کر بیٹھ گئی اور میرے گلاس میں سکاچ ڈال کر میری طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"میں نے آج بطخ پکائی ہے۔ خود پکائی ہے۔ تم کھاؤ گے تو حیران رہ جاؤ گے۔"

اتنے میں بادل زور سے گرجا اور مینہ شروع ہو گیا۔ ہم اپنا اپنا گلاس اور بوتلیں اٹھا کر ساگ کر برآمدے میں آ گئے۔ مسز جونس نے آستین سے آنکھیں پونچھ کر کہا۔

"اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔"

اب ہم ہال کمرے میں ایک جگہ بیٹھ گئے۔ اور شراب و بیئر کا دور شروع ہو گیا۔ کھانا میز پر لگا دیا گیا۔ اور خادمہ باورچی خانے والے دروازے میں سٹول پر بیٹھی سگار پی رہی تھی۔ کچھ دیر تک یہاں بیٹھ کر بادہ کشی ہوتی رہی۔ مسز جونس آج دلکش نظر آ رہی تھی۔ ایک تو اس نے ہونٹوں پر لپ سٹک جما رکھی تھی۔ دوسرے غالباً وہ ایک سال بعد آج نہائی تھی۔ کپڑوں سے ایوننگ اِن پیرس کی خوشبو آ رہی تھی۔ معلوم ہو رہا تھا اندر جا کر اس نے اوپر پوری شیشی کی شیشی انڈیل لی ہے۔ میں کافی پی گیا تھا اور نشے میں مست ہو کر بیٹھا سگریٹ سے سگریٹ سلگا رہا تھا۔ مسز جونس کو بھی خوب نشہ چڑھ گیا تھا۔ اس کا سر جھوم رہا تھا۔ وہ بار بار نوکرانی کو بلاتی اور کوئی نہ کوئی کام سونپ دیتی۔ وہ بات بات پر قہقہے لگا رہی تھی۔ اس کا ہر قہقہہ میرے سامنے اس کی جوانی کو لا کھڑا کر رہا تھا۔ ہر قہقہے کے ساتھ مجھے اس کی عمر کم سے کم تر معلوم ہونے لگتی۔ یہ بڑی درد انگیز بات تھی۔ کیونکہ اس طرح غریب بکرا اپنے آپ چھری کی طرف کھنچ رہا تھا۔

اب ہم کھانے کی میز پر بیٹھے تھے۔ مسز جونس نے بطخ مارا بہترین گوشت مجھے کھلا دیا۔ کھانے کے دوران خوب لطیفہ بازی ہوئی۔ بعد میں کافی نے وسکی کا نشہ کم کر دیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ پھانسی کا وقت قریب آ رہا ہے۔ میں تھر تھر کانپنے لگا۔ میں نے نوکرانی کی موجودگی کا فائدہ اٹھا کر مسز جونس سے اجازت لی اور اپنے کمرے میں آ کر اندر سے چٹخنی لگا دی۔ اور بستر پر لیٹ گیا۔ میں نے بتی گل کر دی تھی۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد دروازہ دھڑ دھڑایا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ سمجھ گیا۔ بلا نازل ہو گئی ہے۔ اب سوائے دروازہ کھولنے کے اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھول دیا۔ مسز جونس جلدی سے اندر داخل ہو گئی۔ وہ مجھ سے لپٹ کر بولی۔

"تمہیں اپنا وعدہ یاد نہیں؟ دیکھو تو باہر موسم کتنا خوشگوار ہے۔ بارش ہو رہی ہے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ کیوں نہ باہر برآمدے میں بیٹھا جائے۔"

میں نے لاکھ بہانہ کیا کہ نیند آ رہی ہے۔ سر پھٹا جا رہا ہے۔ مگر مسز جونس کے سامنے ایک نہ چل سکی۔ وہ مجھے کھینچ کھینچ کر باہر نکال لائی۔ برآمدے میں بیٹھ کر موسم سے لطف اندوز ہونے کا تو ایک بہانہ ہی تھا۔ وہ مجھے لے کر سیدھی ہال کمرے میں آ گئی۔ نوکرانی سو

Mujtaza A. Siddiqui
mascom4u@gmail.com
NOVELS
URDU
STORIES

چکی تھی۔ ہال کمرے کی تمام بتیاں گل کر دی گئی تھیں۔ صرف کونے والی سرخ بتی روشن تھی۔ جس کی لال لال نیم روشنی میں مسز جونس کا چہرہ ایک چڑیل سے ملتا جلتا معلوم ہو رہا تھا۔ جو انسانی خون کی پیاسی ہو اور انسان کی تلاش میں سارے شہر کا چکر کاٹ کر آئی ہو۔

یہاں بیٹھ کر اس عورت نے مزید شراب پی اور مجھے بھی پلائی۔ اب ہم دونوں ہی شراب میں دھت ہو گئے۔ وہ مجھے دھکیلتی ہوئی اپنی خواب گاہ میں لے گئی۔ یہ اس کی خوابگاہ اور میرا مقتل تھا۔ وہ خوشی سے ناچ رہی تھی اور میں خوف سے کانپ رہا تھا۔ میرے گھٹنے ایک دوسرے سے بج رہے تھے۔ جھری میری گردن کے قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ مسز جونس نے سارے کپڑے اتار دیئے۔ اور مادر زاد برہنہ ہو کر کمرے میں ڈانس کرنے لگی۔ اس وقت مجھے وہ ایک اونٹنی لگی جو پاگل ہو گیا ہو۔ میرا دل متلانے لگا۔ مگر مجبور تھا۔ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے دھکا دے کر مجھے پلنگ پر گرا دیا۔ اس کے بعد کیا ہوا مجھے نہیں معلوم ---!

صبح اٹھ کر دیکھا کہ اپنے بستر پر پڑا ہوں اور سارا جسم یوں درد کر رہا ہے جیسے رات بھر کسی تھانے میں میری ٹھکائی ہوتی رہی ہو۔ میں نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ گالوں پر اور گردن پر دانتوں کے کاٹے کے نشان تھے۔ جگہ جگہ سرخی کے دھبے پھیلے ہوئے تھے۔ مسز جونس نے میرے لئے پانی گرم کر رکھا تھا۔ اس نے مجھے خود گرم پانی سے نہلایا۔ میرے زخموں پر ٹکور کی۔ بار بار معافی مانگی کہ رات اس سے زیادتی ہو گئی۔ میں بدن پر ہاتھ لگا لگا کر دیکھ رہا تھا کہ اور کس جگہ درد ہو رہا ہے۔ دفتر میں سارا دن اسپرو کھاتا اور سارا دن اٹھتے بیٹھتے ہائے وائے کرتا رہا۔ دوسرے روز جا کر کہیں میرے ہوش ٹھکانے ہوئے۔ اب میں پوری طرح سمجھ گیا تھا کہ عورت کہاں سے شروع ہوتی ہے اور خود کہاں جا کر ختم ہوتی ہے اور مرد کو کہاں جا کر ختم کرتی ہے۔ میں مسز جونس کے سائے سے بھی بھاگنے لگا تھا۔ میں نے فوراً شہر میں کسی دوسری جگہ کی تلاش شروع کر دی۔ اتوار کو میں اولمس پیلس سے گال روڈ پر ایک فلیٹ میں شفٹ کر گیا۔ یہ فلیٹ تین کمروں پر مشتمل تھا اور دو سو روپے اس کا کرایہ تھا۔ کرایہ اگرچہ زیادہ تھا۔ مگر مسز جونس کے پنجے سے نکلنے کے لئے میں چار سو روپے ماہوار پر بھی جگہ لینے کو تیار تھا۔ جب میں ٹرک میں سامان لاد کر جانے لگا تو مسز جونس مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔

"آخر تم کیوں جا رہے ہو؟ تمہیں یہاں کیا تکلیف تھی؟ ہم نے تمہیں کبھی ناراض نہیں ہونے دیا؟ اب کہاں جا کر رہو گے؟ کیا ملنے آیا کرو گے؟"

میں نے مسکرا کر کہا۔

"کیوں نہیں! میں تو روز شام کو ملنے آیا کروں گا۔ دراصل مجھے دفتر کے پاس ہی جگہ مل گئی ہے۔ میں بھلا شام کی محفل کو بھلا سکتا ہوں؟"

حالانکہ دل میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ بلا سر سے ٹلی۔ مجھے تو بوریلا چوک کے نام ہی سے وحشت ہونے لگی تھی۔ میں جلدی سے ٹرک میں بیٹھ گیا۔ ہاتھ ملا کر سب سے رخصت ہوا اور ڈرائیور سے کہا۔

"جلدی یہاں سے نکل چلو۔"

پیر وار کو میں نے سارا دن ایلورا کے فون کا انتظار کیا۔ لیکن کوئی فون نہ آیا۔ میں نے سوچا شاید منگل وار کو وہ فون کرے۔ مگر منگل کا بھی سارا دن گزر گیا۔ اس کا کوئی فون نہ آیا۔ میں بے چین ہو گیا۔ کیونکہ ایلورا وعدے کی بڑی پابند تھی۔ کچھ مجھے بھی اس پراسرار پچھلے جنم کی ساتھی سے محبت ہو گئی تھی۔ منگل کی شام کو میں ٹمپل روڈ پر اس کے مکان کے سامنے سے گزرا۔ سوچا شاید مکان پر قفل پڑا ہو اور وہ کولمبو سے باہر چلی گئی ہو۔ لیکن مکان میں روشنی ہو رہی تھی۔ دروازے پر کوئی تالا نہیں تھا۔ گویا ایلورا وہیں تھی۔ پھر وہ مجھ سے وعدہ کر کے ملنے کیوں نہیں آئی؟ بیمار تو نہیں ہو گئی؟ میں وہاں سے سیدھا چوک والے بدھی مندر میں گیا۔ وہاں گھنٹہ بھر بیٹھا رہا۔ لیکن ایلورا کی شکل کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ناکام ہو کر واپس فلیٹ پر آ گیا۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔ ہر روز صبح سے شام تک میں ایلورا کے فون کا انتظار کرتا رہا۔ ذرا گھنٹی بجتی اور میرا دل دھڑکنے لگ جاتا۔ شاید یہ ایلورا کا فون ہو۔ لیکن وہ شبھ گھڑی نہیں آ رہی تھی۔ ایلورا کہیں گم ہو گئی تھی۔ آخر مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس کے گھر میں داخل ہونے کی کوئی صورت نکالی جائے۔ میں نے ایک روز دفتر کی ایک فائل کاپی اور پنسل لی اور گاڑی میں بیٹھ کر سیدھا ٹمپل روڈ والے ایلورا کے مکان پر آ گیا۔ گاڑی کھڑی کر کے میں نے دروازے پر دھڑکتے ہوئے دل سے دستک دی۔

شام کا وقت تھا۔ میرا خیال تھا کہ سبھی لوگ گھر پر موجود ہوں گے۔ دوسری بار دستک دینے پر ایک کالی سی نوعمر لڑکی نے دروازہ کھولا۔ میں نے کہا۔

NOVELS URDU STORIES
Murtaza A. Siddiqui
murtazasc4u@gmail.com

"اپنے ڈیڈی کو بلاؤ۔"

لڑکی مسکرا کر اندر بھاگ گئی۔ تھوڑی دیر بعد ایک کالا سا دبلا پتلا ادھیڑ عمر کا آدمی نمودار ہوا۔ اس نے پاجامہ کرتہ پہن رکھا تھا۔ آنکھوں پر سنہری فریم کا چشمہ لگا تھا۔ یہ ایلورا کا وکیل باپ تھا۔ میں نے مسکرا کر سلام کیا۔ اس نے خندہ پیشانی سے جواب دیا۔ میں نے کہا۔

"معاف کیجیے گا آپ کو تکلیف دی۔ میں ریڈیو سیلون کا نمائندہ ہوں۔ ہم نے ابھی ابھی ایک نیا فیچر پروگرام شروع کیا ہے۔ جس میں ہم کولمبو شہر کے مختلف اور پرانے وکیلوں کی گھریلو زندگی کا جھلکیاں پیش کر رہے ہیں۔ آپ سے اسی پروگرام ------"

ایلورا کے باپ نے مسکرا کر کہا۔

"اندر تشریف لے آئیے۔ آئیے آئیے ------"

وہ مجھے اپنے ساتھ دروازے کا پردہ اٹھا کر اندر کمرے میں لے گیا۔ یہ وہی کمرہ تھا جس میں جلتی ہوئی بتی کی روشنی مجھے سامنے والے ہوٹل میں بیٹھ کر دکھائی دیا کرتی تھی۔ برآمدے میں وہ کرسی بھی پڑی تھی جس پر اس روز ایلورا بیٹھ کر کتاب پڑھ رہی تھی اور کنکھیوں سے مجھے بھی دیکھتی جاتی تھی۔ کمرا بڑی سادگی سے سجایا گیا تھا۔ دیوار کے ساتھ آمنے سامنے دو پلنگ بچھے تھے۔ دیوار میں مدراس کے درویش شاعر تیاگ راجہ کی بڑی تصویر لگی تھی۔ کارنس پر بدھ کے دو مجسمے پڑے تھے۔ نیچے میز پر گلدان رکھا تھا۔ جس میں پھول مرجھا رہے تھے۔ ایک عورت سفید دھوتی پہنے تخت پوش پر بیٹھی ترکاری بنا رہی تھی۔ ایلورا کے باپ نے کہا۔

"یہ میری بیوی ہے۔"

وہ مسکرا رہا تھا۔ بڑا ہنس مکھ وکیل تھا۔ ایلورا کی ماں نے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور پھر ترکاری بنانے میں مصروف ہو گئی۔ وہ لڑکی جس نے دروازہ کھولا تھا۔ پلنگ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی اور شرارتی نظروں سے میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔ میں نے جعلی فائل کھول کر اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر نوٹ بک اور پنسل نکال کر پوچھا۔

"آپ یہاں کب سے مقیم ہیں؟"

"کئی سالوں سے یہاں رہ رہا ہوں۔"

"کیا آپ کو یہ شہر پسند ہے؟ میرا مطلب ہے کیا آپ کو اپنا وطن یاد نہیں آتا؟"

ایلورا کا باپ ہنس پڑا اور عینک اتار کر اس کے شیشے کو پونچھتے ہوئے بولا۔

"ہمارا وطن تو وہیں ہے جہاں ہماری روزی ہے۔ جہاں ہمارے بال بچوں کا پیٹ بھرتا ہے۔ ویسے مدراس یاد ضرور آتا ہے۔ پھر وہ زیادہ دور بھی نہیں۔ سال میں ایک آدھ چکر ضرور لگا آتے ہیں۔"

میری نگاہیں ایلورا کو تلاش کر رہی تھیں۔ مگر وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ کیا وہ کسی رشتہ دار کے ہاں گئی ہوئی ہے۔ یہ تو بڑی بری بات تھی۔ اس کے بعد اس گھر میں داخل ہونے کا اتنا اچھا موقع پھر کہاں آئے گا۔ ایلورا کو آج ضرور موجود ہونا چاہیئے تھا۔ ایلورا کے باپ سے باتیں کئے جانا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ میں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کے کتنے بچے ہیں؟"

"صرف ایک لڑکی ہے جی۔ یہ لڑکی جو آپ کے سامنے بیٹھی ہے۔ گیارہ برس کی ہے۔ مگر بڑی شرارتی ہے۔ سارا دن کھیلتی رہتی ہے۔ سکول کا کام بالکل نہیں کرتی؟ کیوں پدمنی؟"

پدمنی جھینپ گئی۔ اس کی ماں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ اور پھر بڑے اطمینان سے ترکاری کاٹنے لگی۔ میں نے سوچا شاید میں نے غلط سنا ہے۔ میں نے پھر پوچھا۔

"کیا آپ کی صرف ایک ہی بچی ہے؟"

"جی ہاں صرف ایک ہی بچی پدمنی ہے۔"

میں سناٹے میں آ گیا۔ تو کیا ایلورا یہاں نہیں رہتی؟ ایلورا اس شخص کی بیٹی نہیں ہے؟ لیکن میں نے تو اسے کئی بار اس گھر کے برآمدے میں کتاب پڑھتے، برآمدے میں گیلے کپڑے نچوڑ نچوڑ کر ڈالتے ------ اپنی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھتے دیکھا ہے۔ ہو سکتا ہے ایلورا ان کی رشتے دار ہو اور کوئی دن گذارنے یہاں آئی ہو۔ مگر ایلورا نے خود کہا تھا کہ وہ اپنے ماں باپ کے پاس ٹمپل روڈ پر رہتی ہے۔ یہ کیا ماجرا ہے؟ کیا گورکھ دھندا ہے؟ میں نے بڑے طریقے سے پوچھا۔

"کیا یہاں کولمبو میں آپ کے دوسرے رشتہ دار لوگ بھی رہتے ہیں؟"

وکیل نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔

"جی نہیں۔ یہاں ہمارا کوئی رشتہ دار نہیں۔ ہمارے رشتے دار مدراس میں ضرور رہتے

Murtaza A. Siddiqui
mascom4u@gmail.com
NOVELS URDU STORIES

ہیں - وہ بھی ہمیں ملنے یہاں کبھی نہیں آئے - دراصل جی وکیل کی زندگی بڑی تنہائی کی زندگی ہوتی ---"

وکیل باتیں بنائے جا رہا تھا - نوکر چائے کا پیالہ میرے پاس میز پر رکھ گیا تھا - مجھے کچھ خبر نہ تھی - میری کنپٹیاں بجنے لگی تھیں - اب میں بے تاب تھا کہ ایلورا کا نام لے کر ان سے دریافت کروں کہ اس نام کی لڑکی یہاں کبھی نہیں آئی تھی کیا؟ میں نے سگریٹ جلا کر صاف صاف پوچھ لیا -

"ایک بات بتائیے - کیا یہاں ایلورا نام کی کوئی لڑکی بھی رہتی تھی - بات دراصل یہ ہے جی کہ میرے ایک دوست نے کہا تھا کہ اس نام کی لڑکی وکالت کرتی ہے اور اسی علاقے میں رہا کرتی ہے -"

وکیل نے نفی میں سر ہلایا اور بولا -

"یہ نام تو زندگی میں پہلی بار سنا ہے جناب! ایلورا نام کی لڑکی تو یہاں آس پاس کوئی بھی نہیں - کیوں جی تمہیں معلوم ہے؟"

وکیل نے اپنی بیوی سے پوچھا - ادھیڑ عمر عورت نے بھی نفی میں سر ہلا کر کہا -

میں نے یہ نام پہلے کبھی نہیں سنا - اس نام کی لڑکی اس علاقے میں کہیں بھی نہیں رہتی -"

میں بت بنا تھا - اب میں سب کچھ بھول گیا تھا کہ کس غرض سے، کیا بہانہ بنا کر اس گھر میں داخل ہوا تھا - میرے سامنے صرف ایلورا کی تصویر تھی - جو دھند لکے میں گم ہو رہی تھی - میں نے بڑی بے باکی سے ایلورا کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا -

"وہ بالوں میں پھول لگاتی تھی - اس کی آنکھیں شربتی تھیں - گال پر ایک کالا تل بھی تھا - کانوں میں سبز پتھر ہوتے تھے - نازک سی لڑکی تھی -"

"جی نہیں ---- یہاں ایسی کوئی لڑکی نہیں رہتی تھی -"

"لیکن میں نے خود اسے اس مکان کے برآمدے میں کرسی پر بیٹھے پڑھتے دیکھا ہے -"

"آپ کو مغالطہ ہوا ہے جناب -"

"ایک روز وہ گیلی ساڑھی باہر الگنی پر ڈال رہی تھی -"

"آپ نے کسی دوسرے گھر میں اسے دیکھا ہوگا -"

"ایک روز وہ بھاگ کر اس کمرے میں داخل ہوئی تھی -"

"اس کا نام ایلورا تھا - ایلورا ---- خوبصورت اور پراسرار آنکھوں والی ایلورا -"

"جی نہیں - اس نام کی لڑکی یہاں کبھی نہیں آئی - بلکہ پورے محلے میں ایسی کوئی لڑکی نہیں ہے -"

میں نے چیخ کر کہا - "وہ آپ کی بیٹی ہے - اس نے خود مجھے کہا تھا کہ آپ اس کے باپ ہیں -"

وکیل سہم سا گیا - اس نے آہستہ سے کہا - "میری تو صرف ایک ہی بچی ہے - یہ پدمنی ---- اور کوئی اولاد نہیں -"

میں ایک دم اُٹھا اور باہر نکل آیا - وکیل اس کی بیوی اور بچی پدمنی حیران ہو کر مجھے ہی دیکھتے رہ گئے - میرا سر چکرا رہا تھا - میں ایک فٹ پاتھ پر کھڑا رہا - چاروں طرف گردن گھما کر دیکھا کہ میں ٹمپل روڈ پر ہی ہوں یا کسی دوسری جگہ آ گیا ہوں - وہی ٹمپل روڈ تھی - چوک والا بدھی مندر سامنے نظر آ رہا تھا - سامنے وہی ہوٹل تھا جہاں بیٹھ کر میں ایلورا کو اپنے مکان کے برآمدے میں گھومتے پھرتے دیکھا کرتا تھا - بالکل اسی جگہ سے ایک روز میں ٹرام پر گزرا تھا اور میں نے پہلی بار ایلورا کو برآمدے کے جنگلے سے لگ کر کھڑی دیکھا تھا - وہ ٹکٹکی باندھے مجھے تک رہی تھی اور تکتی ہی چلی گئی تھی - ڈرائیور نے گاڑی میں سے نکل کر مجھے آواز دی - میں نے چونک کر اسے دیکھا - بوجھل قدم اٹھاتا - سڑک کی دوسری طرف گیا - گاڑی میں سوار ہو کر سر پیچھے لگا دیا - اور غور سے ایلورا کے گھر کی طرف دیکھنے لگا - وہی دروازہ وہی لکڑی کا جنگلا، وہی برآمدہ، وہی کمرہ، کمرے کا وہی پردہ، برآمدے میں پڑی ہوئی وہی کرسی، پھر ایلورا کہاں گم ہو گئی - کیا میں نے بیداری میں کوئی خواب دیکھا تھا؟ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میرے ہونٹوں پر ایلورا کے ہونٹوں کی شہد ابھی تک موجود ہے -

میرے جسم سے ابھی تک ایلورا کے جسم کی خوشبو اُٹھ رہی ہے - اس کے کانوں میں جگمگاتا ہوا سبز پتھر ابھی تک میری آنکھوں کے سامنے چمک رہا ہے - میں واپس فلیٹ پر آ گیا - ساری رات میں نے جاگ کر گذار دی - صبح منہ اندھیرے اس ہوٹل کے باہر والے ناریل کے درختوں کے جھنڈ میں گیا - جہاں ایک منگل وار کو ایلورا میرے ساتھ بیٹھی تھی - اور جہاں اس نے پہلی بار مجھ پر یہ انکشاف کیا تھا کہ وہ پچھلے جنم میں میری بیوی رہ چکی ہے -

Murtaza A. Siddiqui
murtazascom4u@gmail.com
NOVELS URDU STATUS

ناریل کے وہ دونوں درخت اسی طرح کھڑے تھے۔ جس کے سائے میں اس روز ہم دونوں نے بیٹھ کر کافی پی تھی۔ میں نے درختوں کو ہاتھ سے چھوا۔ جیسے پوچھا۔ ایلورا کہاں چلی گئی پیارے درختو! کیا تم نے اسے دیکھا ہے؟ اس کے جوڑے میں سفید کنول تھا۔ کانوں میں سبز پتھر تھے اور ماتھے پر سرخ تلک تھا۔۔۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

شام کو میں پھر ٹمپل روڈ پر گیا۔ گھنٹہ بھر چوک والے مندر میں پھرتا رہا۔ کبھی صحن والے ستون کی چھت کو دیکھتا جس کے ساتھ لگ کر ایلورا نے مجھ سے پہلی بات کی تھی۔ کبھی مندر کی چھت پر جا کر اس منڈیر کو تکنے لگتا جس کے اوپر درخت کی گنجان شاخوں کا سایہ تھا اور جہاں میں نے پہلی بار ایلورا کے سرخ ہونٹوں کے شگوفوں کو چوما تھا۔ میں پاگلوں کی طرح پھٹی پھٹی آنکھوں سے مندر میں داخل ہونے والی ہر عورت کو گھور رہا تھا۔ مگر ایلورا کا سایہ بھی کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایلورا کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ کہیں یہ میرا وہم ہی نہ ہو۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم ایک شخص کے ساتھ بیٹھ کر دن بھر باتیں کریں، کافی پئیں۔ اس سے بغلگیر ہوں اور پھر یہ باور کر لیں کہ اس کا اس دنیا میں کوئی وجود ہی نہیں۔ کیا میں مندر کی چھت والی شام کو بھول سکتا ہوں؟ کیا میں سینما کے کیبن والی دوپہر بھول سکتا ہوں؟ کیا میں وہ لمحات بھلا سکتا ہوں جو ہم نے ایک دوسرے کی معیت میں سمندر کے کنارے ناریل کے جھنڈوں میں بسر کئے تھے؟ اگلے روز میں ٹاور برج والی مارکیٹ کی اس بلڈنگ میں گیا۔ جہاں ایک روز سینما سے واپسی پر میں نے ایلورا کو گاڑی میں چھوڑا تھا اور جس کی سیڑھیاں وہ میرے سامنے چڑھ کر اوپر گئی تھی۔ یہاں اس کی کوئی سہیلی رہتی تھی۔ میں بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔ اوپر جا کر معلوم ہوا کہ وہاں کوئی رہائشی مکان ہی نہیں ہے۔ وہاں ساری بلڈنگ میں اوپر سے نیچے تک مختلف فرموں کے دفتر ہی دفتر ہیں اور کوئی کنبہ رہائش پذیر نہیں ہے۔ میں پریشان سے پریشان تر ہو رہا تھا۔ آخر ایلورا کا معمہ کیا تھا؟ وہ درحقیقت کوئی عورت تھی یا محض چھلاوا؟ اسے زمین کھا گئی یا آسمان اٹھا کر لے گیا؟ کیا وہ پھر کبھی مجھ سے نہیں ملے گی؟ کیا اب اگلے جنم میں درشن ہوں گے؟

دو مہینے میں نے بڑی اداسی اور پریشانی میں بسر کئے۔ ایلورا کا خیال ہر گھڑی مجھ پر چھایا رہتا۔ یوں لگتا جیسے وہ میرے سامنے کھڑی مجھے اپنی گہری پراسرار آنکھوں سے دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔ اس کے ماتھے کا تلک انگارہ بن کر دہک رہا ہے اور کانوں میں سبز پتھر چمک

رہے ہیں۔ تیسرے مہینے میرے لئے وہاں رہنا زیادہ دشوار ہو گیا۔ کولمبو شہر کے بازار اور سمندر کا کنارہ مجھے کاٹ کھانے کو دوڑنے لگا۔ ہر گلی، ہر بازار، ہر ہوٹل، ہر سینما اور ہر مارکیٹ کی نکڑ پر مجھے ایلورا کا مسکراتا ہوا پراسرار چہرہ دکھائی دیتا اور پھر غائب ہو جاتا۔ میں نے نوکری سے استعفیٰ دے دیا اور سامان باندھ کر واپس چلنے کو تیار ہو گیا۔ صبح کی گاڑی مجھے کولمبو سے رخصت ہونا تھا۔ پراسرار ایلورا کے شہر سے رخصت ہونا تھا۔ وہ رات میں نے شہر کی آوارہ گردی کرتے گزار دی۔ پہلے سمندر کے کنارے والے ناریل کے درختوں میں جا کر ایلورا کو یاد کرتا رہا۔ اسے آوازیں دیتا رہا۔ پھر رات گئے ٹمپل روڈ والے مندر میں آ کر اس کی چھت پر بیٹھ گیا اور ایلورا کو یاد کر کے خون کے آنسو بہاتا رہا۔ مندر میں گہری خاموشی طاری تھی۔ بدھ کا مجسمہ اپنے استھان پر آنکھیں بند کئے مکمل سکوت کی حالت میں چپ چاپ بیٹھا تھا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کو ایلورا کے راز کا علم ہے مگر وہ مجھے نہیں بتا رہا۔ وہاں سے اٹھ کر ٹمپل روڈ پر واپس ایلورا کے مکان کی طرف چل پڑا۔ ایلورا کے مکان کا دروازہ بند تھا۔ کمرے کی بتی گل ہو چکی تھی۔ برآمدے میں اندھیرا تھا۔ وہ آرام کرسی دیوار کے ساتھ لگی تھی جہاں ایک روز میں نے ایلورا کو کتاب پڑھتے دیکھا تھا۔ میں نے بند دروازے کو ہاتھ سے چھوا اور میرے ہونٹ کپکپانے لگے۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اچانک جیسے کسی نے آہستہ سے مجھے پکارا۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ آواز ایلورا کی تھی۔ جنگلے کے اوپر ایلورا کی پراسرار شکل میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ میں نے دونوں ہاتھ اس کی طرف کر دیئے۔ ایلورا کا عکس غائب ہو گیا۔ وہاں اب کچھ بھی نہیں تھا۔

صبح پہلی گاڑی میں کولمبو سے رخصت ہونے کے لیے سٹیشن پر آ گیا۔ میں نے کسی کو اپنی روانگی کی خبر نہیں کی تھی۔ میں چپکے سے گاڑی کے ڈبے میں بیٹھ گیا۔ ٹھیک وقت پر انجن نے سیٹی بجائی۔ گارڈ نے جھنڈی ہلائی اور گاڑی پلیٹ فارم پر کھسکنے لگی۔ جب گاڑی شہر سے میلوں باہر نکل آئی اور گھنے جنگلوں سے گذر رہی تھی تو میں نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے ایلورا گنجان جنگلوں کے پراسرار اندھیروں میں کھڑی ہاتھ کے اشارے سے مجھے بلا رہی ہے۔ میں نے جلدی سے کھڑکی بند کر دی اور آنکھیں بند کر کے سر دیوار سے لگا دیا۔ مجھے وہ لوک گیت یاد آنے لگا جو ایلورا نے سمندر کے کنارے ناریل کی چھاؤں میں بیٹھ کر مجھے سنایا تھا۔

NOVELS URDU
Murtaza A. Siddiqui
rascom4u@gmail.com

میرے ہرن کو شکاری لے گیا۔
الوداع پیارے ہرن!
اب عمر بھر درشن نہ ہوں گے۔

Murtaza A. Siddiqui
mascom4u@gmail.com
NOVELS URDU STORIES
mascom4u@gmail.com
Murtaza A. Siddiqui